امام غزالیؒ

سیّد ابوالحسن علی ندوی





دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد



بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com



امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

مصنف

سید ابو الحسن علی ندوی رح



دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

نام کتاب	:	امام غزالیؒ
مصنف	:	سید ابوالحسن علی ندویؒ
نگران طباعت	:	حیران خٹک
سرورق	:	محمد طارق اعظم
کمپوزنگ	:	محمد ظفر
حروف خوانی	:	محمد اشتیاق خاکی
طابع	:	ادارہ تحقیقات اسلامی پریس، اسلام آباد
اشاعت اوّل	:	۲۰۱۱ء
تعداد اشاعت	:	۲۰۰۰
قیمت	:	۷۰/۔ روپے

ISBN.978-969-556-252-9

ناشر

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

مالک ارض و سما نے جب انسان کو منصب خلافت دے کر زمین پر اتارا تو اسے رہنمائی کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات سے بھی نوازا۔ شروع سے لے کر آج تک یہ دین' دین اسلام ہی ہے۔ اس کی تعلیمات کو روئے زمین پر پھیلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کو مبعوث فرمایا اور ان سب کو یہی فریضہ سونپا گیا کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان عبودیت کا حقیقی رشتہ استوار کریں' کیونکہ اسی میں انسان کی دنیوی و اخروی نجات کا راز مضمر ہے۔ یہ دین محض چند عبادات اور مذہبی رسومات کی ادائیگی پر مبنی مذہب نہیں جس کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو اور اس کے تمام تقاضے محض چند مذہبی رسومات کی انجام دہی سے پورے ہو جاتے ہوں' بلکہ یہ ایک ایسا مکمل نظام حیات ہے جو انسان کو زندگی کے ہر مرحلے پر ٹھوس رہنمائی فراہم کرتا ہے اور ہر مشکل اور پریشانی میں اس کی دستگیری کر کے اسے نہایت کامیابی کے ساتھ مصائب و مشکلات اور پریشانیوں کی دلدل سے نکالتا ہے۔ یہ نظام حیات انسان کو صرف اس جہان فانی میں کامیاب زندگی گزارنے کا گر ہی نہیں بتاتا' بلکہ اس پر خلوص دل سے عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں دار آخرت میں سرخرو و سرفراز ہونے کی ضمانت بھی دیتا ہے۔

چونکہ دین اسلام اس علیم و خبیر ذات کا عطا کردہ نظام حیات ہے جس نے خود انسان کو تخلیق کیا ہے' جسے انسانی زندگی کے ایک ایک لمحے کی خبر ہے اور جو ہر دور کی انسانی

ضروریات اور تقاضوں سے بخوبی واقف ہے' اس لیے اس کا ودیعت کردہ نظام' دین اسلام بھی انسانی زندگی کا ہر پہلو سے مکمل احاطہ کرتا ہے۔ یہ عقائد و معاملات' عبادات و اخلاق' تہذیب وثقافت' معیشت و معاشرت' قانون و سیاست' تعلیم و تعلم غرض زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔

اسلام کے متعلق قرآن دعوے کے ساتھ کہتا ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ

یعنی سچا دین تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

تاریخ کے اوراق اس بات پر شاہد ہیں کہ مختلف ادوار میں جن اقوام نے اس ضابطہ حیات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزاری' اس نظام کے خالق کے ساتھ اپنا رشتہ عبودیت مضبوطی کے ساتھ جوڑا' وہ کامیاب و سرخرو رہے اور دنیا کی امامت ان قوموں کے ہاتھوں میں رہی لیکن جب بھی ان کا تعلق اس دین کے ساتھ کمزور پڑ گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اس ارفع و اعلیٰ نظام کے بجائے گم کردہ راہ انسانوں کے افکار و نظریات میں اپنی نجات ڈھونڈنے لگے تو ذلیل وخوار ہوئے۔

جب تک دنیا نے تمدنی اور اجتماعی زندگی کے وہ وسائل پیدا نہیں کر لیے جو ساری دنیا کو داعیٔ حق کی دعوت پر جمع کرنے کے لیے ضروری تھے' اس وقت تک اللہ تعالیٰ الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کو بھیجتا رہا لیکن جب انبیاءؑ کی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں قوموں کا اخلاقی و اجتماعی شعور اس سطح پر آگیا کہ وہ ایک عالم گیر نظام عدل کے تحت زندگی بسر کر سکیں اور دنیا کے مادی اور تہذیبی وسائل نے بھی اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغام دنیا کے ہر گوشے میں بہ سہولت پہنچ سکے تو اللہ کی رحمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے اور ان کے ذریعے سے لوگوں کو وہ مکمل نظام زندگی عنایت فرمائے جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات وضروریات

کے عین مطابق ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس دین کی تکمیل کرتے ہوئے اعلان فرمادیا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

لہٰذا اب رہتی دنیا تک کسی دوسرے ضابطہ حیات اور نظام زندگی کی ضرورت باقی ہے نہ کسی رسول کی رہنمائی درکار ہے۔ سلسلہ نبوت کے تکمیل تک پہنچنے کے بعد دعوت دین کے اس مقدس فریضے کی ذمہ داری اس امت کے سپرد کی گئی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی میں تیار ہوئی تھی۔

امت مسلمہ کا مقصد تخلیق ہی دعوت دین اور بشارت حق ہے۔ اس امت کی اصل ذمہ داری یہی ہے کہ مخلوق اور خالق کے درمیان حقیقی رشتے کو استوار کرے اور انسان کو عبودیت کے حقیقی مفہوم سے نہ صرف آگاہ کرے بلکہ اس کو اس بندھن کے تمام تر تقاضے پورا کرنے کی دعوت دے۔ یہ امت اس رسولؐ کی جانشین ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے مکمل کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اب اس امت کو اپنی تمام تر صلاحیتیں اور وسائل روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلانے اور اسے اپنانے کی دعوت دینے کے لیے وقف کرنا ہوں گے۔ اس کے لیے یہی راہ نجات ہے۔

دعوت دین سے متعلق اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ یہ وہ بنیادی فریضہ ہے جس کی انجام دہی کے لیے امت مسلمہ کو بھیجا گیا ہے اور اب مسلمانوں کے لیے واحد راہ نجات یہی ہے کہ وہ نہ صرف خود اپنے اجتماعی اور انفرادی معاملات و معمولات اس دین کی تعلیمات کے مطابق انجام دیں بلکہ دوسروں کو بھی اس کی برکات و ثمرات سے آگاہ کر کے اس دین کو قبول کرنے کی دعوت دیں اور اس سلسلے میں اپنی تمام مادی، علمی اور فکری صلاحیتیں بروئے کار لائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی صلاحیتوں کا بہترین مصرف ہی یہی ہے۔

جب تک مسلمانوں کو اپنے اس مقصد تخلیق کا شعور حاصل رہا اور وہ دعوت دین میں ہمہ تن مصروف رہے، رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو زندگی کے ہر شعبے میں مشعل راہ بنائے رکھا، تو دنیا جنت ارضی کا سماں پیش کرنے لگی لیکن جب اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق کمزور پڑ گیا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی شامل حال نہیں رہی اور ذلت و مسکنت نہ صرف ان کا مقدر بنی بلکہ دنیا کی دیگر اقوام بھی سکون و راحت کی تلاش میں دربدر بھٹکتی پھر رہی ہیں۔

اس تشویش ناک اور ناگفتہ بہ صورت حال کے باوجود یہ بات باعث اطمینان رہی ہے کہ امت مسلمہ کے ہر دور میں ایسے افراد اور ادارے موجود رہے ہیں جو نامساعد حالات کے باوجود دعوت دین کے فریضے کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف رہے ہیں، مایوسی اور ناامیدی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں توحید کی شمع جلتی رہی اور کچھ بندگان خدا نہایت خلوص اور دل سوزی کے ساتھ مخلوق کو خالق سے رجوع کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ ان سعید روحوں نے انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش کی بجائے ایک اللہ کی عبادت کی تعلیم دی اور دین کو اس کی اصل روح کے ساتھ پیش کیا۔ ان بزرگوں اور داعیان حق کی انہی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ ہر دور میں کبھی بھی قلب سلیم رکھنے والے مسلمانوں کے لیے شرک و بدعت کے غبار میں دین حقیقی کو پہچاننا مشکل نہ رہا۔

ان عظیم شخصیات میں ایک امام غزالی بھی ہیں۔ امام غزالی کے زمانے میں اسلامی دنیا میں الحاد اور باطنیت کی مسموم ہوا پوری شدت کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے معاملے میں مسلمان متکلمین کا رویہ مدافعانہ اور معذرت خواہانہ تھا اور خود کسی نے فلسفے کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی جرأت نہیں کی۔

امام غزالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے فلسفے کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کی اور اپنی کتاب مقاصد الفلاسفہ میں پوری غیر جانبداری کے ساتھ فلاسفہ کے نظریات اور مباحث کو مدون کر دیا۔ اس طرح اپنی کتاب تہافت الفلاسفہ میں فلسفہ کی الٰہیات و طبیعیات پر اسلامی

نقطہ نظر سے تنقید کی اور اس کی علمی کمزوریوں، استدلال کی صنعت اور فلاسفہ کے باہم تناقص و اختلاف کو پوری جرات و قوت کے ساتھ ظاہر کیا۔ اسی طرح ان کے قلم سے احیاء العلوم جیسی بے مثل کتاب تحریر ہوئی جس سے اسلامی حلقے طویل عرصے تک متاثر رہے ہیں۔

اسی نابغہ روزگار شخصیت کے احوال و آثار جاننے کے لیے دعوۃ اکیڈمی سید ابوالحسن علی ندوی کی شہرہ آفاق کتاب تاریخ دعوت و عزیمت کا امام غزالی کے متعلق باب پیش کر رہی ہے۔

اُمید ہے کہ قارئین دعوۃ اکیڈمی کی اس کاوش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔

حیران خٹک

ڈپٹی ڈائریکٹر (مطبوعات)

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

مقدمہ

اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل

زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے، اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے، اور اعلان کیا جاچکا ہے کہ:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ۔۳)

آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لیے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے، دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے، اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے۔

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سدا جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہے، اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہے، مگر وہ زندگی سے پُر ہے، اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے، جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو، اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہے جو علیم و حکیم صانع کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔

ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (الانعام:۹۶)

يُؤْمِنُوْنَ (الانعام:۱۲)

یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (النمل:۸۸)

کاریگری اللہ کی جس نے ہر چیز کو محکم کیا

اُمتِ اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پراز تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے، اور یہ امت آخری اور عالمگیر امت ہے، اس لیے یہ کہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا، اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے، وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہے، اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے، وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کے بقا اور تسلسل کے لیے غیبی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور مکان وزمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ ﷺ کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں، جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے، (اور اس وقت کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا، جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے، اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہے، اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ امت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں

ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے، بلکہ انتظامِ خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت تھی، اور زہر کو جس "تریاق" کی حاجت تھی، وہ اس امت کو عطا ہوا۔

اسلام کے قلب و جگر پر حملے

شروع ہی سے اسلام کے قلب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لا سکتا، دنیا کے دوسرے مذاہب جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی، اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہار نہ سکے، اور انھوں نے اپنی ہستی کو گم کر دیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی، اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا۔ ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں، اسلامی روح اور اس کے نظامِ عقائد کے لیے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لیے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا۔ دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھو دیتا اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کر لے گیا، اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی، بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال و رسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد و لادینیت، اور عقلیت پرستی، کا اسلام پر بارہا حملہ ہوا، اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لا سکے، اور ان کے سامنے سپر ڈال دے، لیکن امتِ مسلمہ کے ضمیر نے تحریفات و تاویلات کا پردہ چاک کر دیا، اور حقیقت اسلام اور "دین خالص" کو اجاگر کیا، بدعات اور عجمی اثرت کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پُر زور حمایت کی، عقائدِ باطلہ کی بے باکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی، تعیشات اور اپنے زمانے کے "مترفین"[1] کی سخت مذمت کی، اور جابر سلاطین کے سامنے کلمۂ

---

1 متکبر دولتمندوں اور مستغنی آسودہ حال اور فارغ البال لوگوں کو قرآن مجید "مترفین" کے لفظ یاد کرتا ہے۔

حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا، اور اسلام میں نئی قوت و حرکت و مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کر دی، یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے، اور طاقت ور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لیے ان کے پاس کوئی نہ کوئی "ید بیضا" تھا جس سے انھوں نے تاریکی کا پردہ چاک کر دیا، اور حق روشن ہو گیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے، اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہے، اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ ﷺ کے نائبین اور امت کے مجددین و مصلحین سے لے گا۔

دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے، جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کر دیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریفات و بدعات کے نرغہ سے نکالے، اس کی حقیقت واضح کرے، اصل دین اور حقیقتِ ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پُرزور صدائے احتجاج بلند کرے، مادیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لیے کمربستہ ہو کر میدان میں آجائے، اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانی سے اس مذہب کے پیروں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دے۔

اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے، وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی میں ایسی تحریفات کا شکار ہوئی جس کی نظیر اس دور کی تاریخ مذاہب میں کہیں نہیں ملتی، وہ ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب سے ایک ایسے مشرکانہ مذہب میں تبدیل ہو گئی، جس کو یونانی اور بودھ افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰۔۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا، یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے دوسری روح، ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک نظام سے

دوسرے نظم کی طرف ایسی جست یا چھلانگ کے مرادف تھی جس میں پہلی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا تھا، ایک مسیحی فاضل (Éruset de Bunsen) اس تغیر و انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے، اس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے اپنے قول و عمل سے کبھی نہیں دی تھی، اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں و مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے، اس کی ذمہ داری حضرت مسیحؑ کے سر نہیں ہے بلکہ یہ سب اس یہودی، عیسائی بے دین پال کا کرشمہ ہے، نیز صحف مقدسہ کی تمثیل و تجسیم کے طریقہ پر تشریح اور ان صحیفوں کو پیش گوئیوں اور مثالوں سے بھر دینے کا نتیجہ ہے، پال نے اسٹیفن (Stephen) کی تقلید میں جو مذاہبِ ایسانی (Essenio) کا داعی ہے، حضرت مسیحؑ کے ساتھ بہت سی بودھ رسوم وابستہ کر دیں، آج انجیل میں جو متضاد کہانیاں اور واقعات ملتے ہیں، اور جو حضرت مسیحؑ کو ان کے مرتبہ سے بہت فروتر شکل میں پیش کرتے ہیں وہ سب پال کے وضع کیے ہوئے ہیں، حضرت مسیحؑ نے نہیں، بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پادریوں اور راہبوں نے اس سارے عقیدہ و نظام کو مرتب کیا ہے، جس کو آرتھوڈکس مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار دے رکھا ہے"[1]۔

مسیحیت نے طویل صدیوں تک اور آج بھی پال کی اس روح اور اس کے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھا، اور اس پوری مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا، جو مسیحیت کے اس بیرونی مستعار اور غیر حقیقی نظام کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کرے، اور اس نقطہ کی طرف واپسی کی کوشش کرے، جس نقطہ پر حضرت مسیحؑ اور ان کے مخلص خلفا اور

---

1 Islam or true Christainity-P.120

متبعین چھوڑ کر گئے تھے، صدیوں پر صدیاں بیت گئیں، اور کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا، جو مسیحیت کے ان نئے اور بیرونی اجزا کو علیحدہ کر سکے، آخر کار پندرہویں صدی مسیحی میں مارٹن لوتھر (M. Luther) جرمنی میں پیدا ہوا، اور اس نے بعض جزئی مسائل میں کچھ محدود قسم کی اصلاح کی، یہ کوئی جوہری یا عمومی اصلاح نہ تھی، اور نہ مسیحیت کے غلط رخ اور اس کے انحراف کے خلاف کوئی بغاوت، گویا مسیحیت کی تاریخ کی تقریباً پندرہ صدیاں انقلاب انگیز بنیادی اور کامیاب اصلاح مذہب کی تحریکوں سے خالی رہیں، اور اس عرصہ میں کوئی کوشش بھی پورے طور پر بار آور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی، مسیحی فضلا کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس طویل مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی شخصیت یا تحریک رونما نہیں ہوئی، جو مسیحیت کی اصلاح یا تجدید میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار (J. Bassmullinger) لکھتا ہے:

"اگر ہم اس کے اسباب تلاش کریں کہ سولہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی کوششوں میں جزوی کامیابی بھی کیوں نہ ہوئی تو بلا کسی دشواری کے کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سبب قرونِ وسطیٰ کے ذہن کی ماضی کی مثالوں کی غلامی تھی"[1]۔

دوسری جگہ لکھتا ہے:

"چرچ کے اصلاح کی کوئی جامع تجویز بروئے کار لانے کی ان کی مسلسل کوششوں کی ناکامی یورپین تاریخ کی ایک جانی بوجھی حقیقت ہے"[2]۔

یہی مقالہ نگار آگے لکھتا ہے:

"سولہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب کی چند نہیں متعدد اور بعض

---

1 Enc. Brittanica-Ed- IX Vol. XX p.320 Article by J.B Mullinger

2 ایضاً ص ۳۲۱

بہت یادگار قسم کی کوششیں کی جا چکی تھیں، لیکن بلا استثنا ان سب کو کلیسا کی لعنت وملامت کا شکار ہو جانا پڑا تھا"[1]۔

اس کے بعد کوئی دوسرا شخص ایسا پیدا نہیں ہوا، جو کلیسا کے خرافات و اوہام اور اس کی زبردستیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا اور اور کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا لوتھر نے (اپنے مخصوص دائرہ عمل اور کمزوری کے باوجود) کیا تھا۔

غرض اس طرح مسیحیت اس راستہ پر مسلسل چلتی رہی، جس کو اس نے اپنے لیے انتخاب کیا تھا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے سر تھوپ دیا گیا تھا، کلیسا کا اثر کم پڑ گیا، اور بعد میں اس کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا۔ یورپ میں مادیت کی حکومت قائم ہوئی، اور اس نے اس اصل مذہب کی جگہ لے لی، اور مغرب کے ہر مذہب کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا، اور مسیحیت میں کوئی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا جو اس مادّیت کا مقابلہ کرتا اور اس کو اپنے صحیح مرکز پر واپس لاتا، یا عیسائیوں میں اپنے مذہب پر اعتماد کو بحال کرتا، ان سب میں وہ روحانی واخلاقی قوت پیدا کرتا جو ان کو مادیت کے ان زبردست تھپیڑوں اور ایمان سوز ترغیبات کے سامنے ثابت قدم رکھ سکے، اور ان کو ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکے، جو علم و اخلاق اور صحیح عیسائی عقائد پر قائم ہو، اور جہاں نئے زمانے کے سوالات، عصر جدید کے مسائل کا حل اس کی روشنی میں ممکن ہو، اس کے برعکس یہ ہوا کہ عیسائی مفکرین، مصنفین مسیحیت کے مستقبل سے خود مایوس ہو گئے اور لادینی مادیت کے مقابلہ میں ان کے اندر احساس کمتری پیدا ہو گیا۔

یہی قصہ مشرق کے مذاہب کے ساتھ بھی پیش آیا، ہندو مذہب بھی اپنی اصل راہ سے بالکل ہٹ گیا، اس نے اپنی سادگی اور خالقِ کائنات سے براہِ راست روحانی نسبت بالکل کھو دی، اخلاقی قوت بھی مفقود ہو گئی، اور اپنی پیچیدگی کی وجہ سے وہ محض ایک دقیق اور غیر عملی فلسفہ بن کر رہ گیا، اور رفتہ رفتہ عقائد میں توحید خالص اور معاملات میں مساوات دونوں اہم چیزوں کا سررشتہ اس کے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا، اور یہی وہ دو اہم بنیادیں تھیں، جن پر کوئی ایسا مذہب قائم ہو سکتا ہے، جس کی جڑیں باطن میں مضبوط ہوں، اور شاخیں ظاہر میں

---

[1] ایضاً ص ۳۲۱

پھیلی ہوئی ہوں۔

اپنیشد کے مصنفین نے بہت کوشش کی کہ اس فساد کا تدارک کریں، چنانچہ انھوں نے ان رسوم کو جو ہندو مذہب اور ہندو سماج پر پوری طرح چھاگئی تھیں، مسترد کر دیا اور اس کی جگہ ایک ایسے فلسفیانہ اور تصوراتی نظام کو پیش کیا جو کثرت میں وحدت کے نظریہ پر قائم تھا، یہ نئی تصویر ہندو مذہب کے علمی حلقوں میں تو ضرور پسند کی گئی، اس لیے کہ ان کا رجحان شروع ہی سے وحدۃ الوجود ہمہ اوست کی طرف تھا، لیکن عوام نے جن کی فکری سطح پست تھی، اور جو عملی نظام اور عملی تعلیمات کے خواہشمند تھے، اس بات کو قبول نہ کیا، اور اس طرح ہندو مذہب رفتہ رفتہ اپنی قوت و تاثیر کھوتا رہا، اس کی طرف سے بے اعتمادی اور بے اطمینانی روز بروز بڑھنے لگی، ہندو سماج کی یہی بے اطمینانی اور بے چینی تھی، جس نے آگے چل کر بودھ کی شخصیت میں جنم لیا، یہ مرحلہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سامنے آیا۔

بودھ نے ایک نیا فکر یا ایک نیا مذہب (اگر اس موقع پر لفظ مذہب کا استعمال درست ہو) پیش کیا جو ترک دنیا، تہذیب نفس، خواہش سے مقابلہ، رحم دلی و ہمدردی، خدمت و عمل اور رسوم و عادات اور طبقاتی کشمکش کی تردید و مخالفت پر قائم تھا، جو ہندو سماج میں آخر زمانہ میں بہت نمایاں ہو گئی تھی، یہ فکر یا یہ مذہب بہت سرعت کے ساتھ پھیلا، اور ایشیا کے جنوبی اور مشرقی حصہ پر جو بحر ہند اور بحر الکاہل کے درمیان واقع ہے، اس کا تسلط قائم ہو گیا۔

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ زبردست مذہبی تحریک بھی اپنے راستے سے ہٹ گئی، اور تحریف کا شکار ہو گئی، مورتیاں اور رسوم وغیرہ جن کے خلاف اس مذہب نے علَم بغاوت بلند کیا تھا، اس پر پھر سے حملہ آور ہوئے، یہاں تک کہ اس کے آخر دور میں وہ بھی شرک اور مورتی پوجا کا مذہب بن کر رہ گیا، جو اپنے پیشرو ہندو مذہب سے مورتیوں کی اقسام

---

1 بودھ مت کے لیے لفظ مذہب کے استعمال میں مجھے تردد اس لیے ہے کہ اس میں خالق اور مبدا و معاد کے سلسلہ میں کوئی عقیدہ یا نظریہ نہیں ملتا اور اکثر مصنفین و مورخین کی یہی رائے ہے، دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ بودھ (Buddha)

اور ان کی تعداد کے سوا کسی اور چیز میں مختلف اور بہتر نہ تھا، اس کی اخلاقیات کو بھی زوال ہوا، افکار و خیالات میں پیچیدگی اور بڑھ گئی، نئے نئے فرقے اور مذہبی گروہ قائم ہو گئے، پروفیسر ایشور اٹوپا اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں:

"بودھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرمار اور مورت پرستی کا دور دورہ دکھلائی دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی، اس میں بدعتیں اور جدتیں یکے بعد دیگرے نظر آ رہی تھیں"[1]۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" (Discovery of India) میں بدھ مت کے بگاڑ اور تاریخی زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنایا، اور بودھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دولتمند ہو گئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے، اوران میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا۔ عبادت کے طریقوں میں سحر اور اوہام داخل ہو گئے، اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تنزل شروع ہو گیا، اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی، (Mrs. Rhys Dayis) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"ان مریضانہ خیالات کے گہرے سایہ میں آ کر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہو گئی، ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لے لی اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضا میں ذہن کی ان پر فریب تخلیقوں سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا، اور بانی مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی

---

1 ہندوستانی تمدن (اردو) ایشور اٹوپا

درس ان الٰہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے"[1]۔

مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں میں گراوٹ پیدا ہو گئی، اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہو گئیں، دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، اس وسیع بودھ دنیا میں اور اس کی حکمرانی کی اس طویل مدت میں کوئی ایسا مصلح سامنے نہ آیا، جو حقیقی بودھ مت کی طرف دعوت دے اور اس جدید اور منحرف مذہب کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے، اور اس کا گذشتہ دور شباب اور اس کی گم شدہ سادگی اور صفائی پھر سے واپس لے آئے[2]۔

غرض قدیم ہندو مذہب، بودھ مت کے سامنے بالکل پنپ نہ سکا، یہاں تک کہ آٹھویں صدی مسیحی میں شنکر آچاریہ[3] نے بدھ مت کی مخالفت اور قدیم ہندو مذہب کی اشاعت کا علم بلند کیا اور آخر کار اس کو اس ملک سے تقریباً باہر ہی کر دیا، یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حیثیت ہندوستان کے بہت سے مذاہب میں ایک قدیم روبہ زوال اور محدود مذہب کی رہ گئی، شنکر آچاریہ نے اپنی ذہانت، مذہبی جرات اور جوشِ عمل سے یہ تو کیا کہ بودھ مت کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا، لیکن وہ اس باب میں کامیاب نہ ہوئے۔ (بلکہ شاید اس کا انہوں نے سرے سے ارادہ ہی نہیں کیا تھا) کہ قدیم ہندو مذہب کو اس کی پہلی اور حقیقی شکل پر واپس لے آئیں، اس میں توحید کا عقیدہ خالقِ کائنات سے براہِ راست اتصال، بندہ اور خدا کے درمیان واسطوں کی نفی، اجتماعی انصاف اور طبقاتی مساوات کی روح پیدا کریں، چنانچہ آج تک یہ دونوں ہندوستانی مذاہب اپنی بدلی ہوئی ہیئت پر قائم ہیں اور دور انحطاط کی میراث رسوم و عادات اور مورتیوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، مذاہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا (Encyclopedia of Religion and Ethics) کے مقالہ نگار (V.S Ghate)

---

1 تلاش ہند ص: ۲۰۱۔۲۰۳

2 ایضاً ص: ۲۰۱۔۲۰۳

3 شنکر آچاریہ آٹھویں صدی کے نصف آخر میں گزرا ہے، ۳۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

جو الفنسٹن کالج بمبئی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور ہندوستان کے قدیم مذاہب و فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، شنکر آچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اس نظام مذہب اور فلسفہ کا زندہ کرنا تھا، جس کی "اوپنشید" میں تعلیم دی گئی ہے، اس نے مطلق وحدۃ الوجود کے عقیدہ کو رائج کر دیا، اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ یہ بتائے کہ "اوپنشید" اور بھگوت گیتا میں قانون پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مکمل وحدۃُ الوجود کی تعلیم ہے، شنکر آچاریہ نے بت پرستی کی نہ مخالفت کی اور نہ حملہ کیا، اس کے نزدیک بت ایک رمز اور مظہر ہیں، شنکر آچاریہ نے رسمیت (Ritualsm) اور کرما کی مذمت کی، لیکن مقبول عام دیوتاوں کی پرستش کی طرف سے مدافعت کی، اپنے نشوو نما کی ایک خاص منزل میں بت پرستی ہماری فطرت کی ایک ضرورت ہے۔ جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے تو پھر بُت پرستی کی ضرورت نہیں رہتی ہے، علامتوں اور رموز کو ترک کر دینا چاہیے۔ جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے"۔ شنکر نے بتوں کی اجازت دی، بحیثیت ایک علامت کے ان لوگوں کے لیے جو ایسے برہمنوں کے مرتبے تک نہیں پہونچ سکے، جو صفات سے آزاد اور ناقابل تبدیل ہوں"[1]۔

بہر حال وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، جو شنکر آچاریہ سے لے کر دیانند سرسوتی اور گاندھی جی تک کی گئیں، اور جن کا مقصد اس مذہب کا اس کی ان صحیح بنیادوں پر احیا تھا، جو نبوت کی دعوت انسان کی فطرت سلیم اور تغیر پذیر عہد سب کے ساتھ ہم آہنگ ہو، ان دونوں مذاہب نے آخر کار مادیت لادینیت کے سامنے بالکل سپر ڈال دی ہے، اور

---

1 ماخوذ از مقالہ شنکر آچاریہ باختصار و انتخاب ملاحظہ ہو:
Enc. of Religion and Ethics- Fourth Editon 1958 Article Sankarachrya

زندگی سے کنارہ کش ہو کر عبادت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں پناہ لی ہے، اور رسوم و عادات اور ظاہر اشکال میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، ہندوستان میں اس وقت کوئی ایسی طاقتور دعوت نہیں جس کا نعرہ اور جس کا منشور یہ ہو (پھر سے مذہب کی طرف آؤ) اس کے برعکس ایسی تحریکیں بہت بیدار اور طاقتور ہیں، جن کا نعرہ اور اصول یہ ہے کہ اپنی پرانی تہذیب کو زندہ کرو، اور ہندوستان کی قدیم تاریخی زبان "سنسکرت" کو پھر سے ملک میں رائج کرو۔

مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں، جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوتِ عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جواں ہیں، مادّیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتہً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پُرجوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنہوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔ ع

اگرچہ پیر ہے مومن جواں ہیں لات و منات

اس کا مقابل جب ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا، اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی رہے گی، تازہ دم مادّیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

ہر نئے فتنہ اور نئے خطرے کے لیے نئی شخصیت و طاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کی اس طویل اور پر آشوب

ہیں، اور ان کی پر اثر بابرکت مجلسوں کی روئداد پیش کی ہے، یہ مکتوبات اور مواعظ کے وہ مجموعے ہیں جن سے ان کے خیالات و افکار، اور جذبات و کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، یا وہ کتابیں جو احتسابِ سوسائٹی پر تنقید اور بدعات و منکرات کے رد و ابطال میں لکھی گئی ہیں، اگر ہمارا مطالعہ اپنی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ کر ان اہم اور گم شدہ تاریخی مآخذ تک وسیع ہو سکتا اور کوئی وسیع النظر نکتہ رس اور باہمت محقق اس موضوع پر جم کر کام کر سکتا تو ایک مربوط و مکمل تاریخ اصلاح و تجدید پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا، اور ہمیں صاف نظر آتا کہ دعوت و عزیمت دونوں چیزیں اس اُمت کے ہر دور اور ہر مرحلہ میں اس کا ساتھ دیتی رہیں، اور انہوں نے کبھی اس کو مایوس اور محروم نہیں کیا۔

اسلام کی میراث

یہ میراث جو ہمارے ہاتھ میں پہنچی (اور جس کو ہم میراث) کے معنی میں نہیں بول رہے ہیں، جو اہلِ مغرب کا مفہوم ہے، اس لیے کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے، ہم میراث سے وہ دولت اور ثروت مراد لیتے ہیں، جو ہمارے اسلاف سے ہماری طرف منتقل ہوئی ہے، علم راسخ، محفوظ و مضبوط عقائد، طاقتور ایمان، سنت سنیّہ، اخلاقِ عالیہ، فقہ و شریعت اور شاندار اسلامی ادب کی ثروت اس میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصہ ہے، جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی منہاج خلافت پر حکومت قائم کی، جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کے خصائص مٹ گئے تھے، ان کو اُجاگر کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، اس لازوال ثروت میں ہر اس شخص کا اضافہ تسلیم کیا جائے گا، جس نے اس دین پر اس کے مآخذ اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سر نو استوار کیا، نو وارد فلسفوں کا ابطال کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی، اور اس امت کو کسی نئے فتنہ میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لیے اس کے دین اور مصادر دین کی حفاظت کی، حدیث و فقہ کی تدوین جدید کا کام انجام دیا، اجتہاد کا دروازہ کھولا اور امت کو تشریح کا خزانۂ عامرہ اور زندگی و

ہیں، اور ان کی پر اثر بابرکت مجلسوں کی روئداد پیش کی ہے، یہ مکتوبات اور مواعظ کے وہ مجموعے ہیں جن سے ان کے خیالات و افکار، اور جذبات و کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، یا وہ کتابیں جو احتسابِ سوسائٹی پر تنقید اور بدعات و منکرات کے رد و ابطال میں لکھی گئی ہیں، اگر ہمارا مطالعہ اپنی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ کر ان اہم اور گم شدہ تاریخی مآخذ تک وسیع ہو سکتا اور کوئی وسیع النظر نکتہ رس اور باہمت محقق اس موضوع پر جم کر کام کر سکتا تو ایک مربوط و مکمل تاریخ اصلاح و تجدید پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا، اور ہمیں صاف نظر آتا کہ دعوت و عزیمت دونوں چیزیں اس اُمت کے ہر دور اور ہر مرحلہ میں اس کا ساتھ دیتی رہیں، اور انہوں نے کبھی اس کو مایوس اور محروم نہیں کیا۔

اسلام کی میراث

یہ میراث جو ہمارے ہاتھ میں پہنچی (اور جس کو ہم میراث) کے معنی میں نہیں بول رہے ہیں، جو اہلِ مغرب کا مفہوم ہے، اس لیے کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے، ہم میراث سے وہ دولت اور ثروت مراد لیتے ہیں، جو ہمارے اسلاف سے ہماری طرف منتقل ہوئی ہے، علم راسخ، محفوظ و مضبوط عقائد، طاقتور ایمان، سنت سنیّہ، اخلاقِ عالیہ، فقہ و شریعت اور شاندار اسلامی ادب کی ثروت اس میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصہ ہے، جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی منہاج خلافت پر حکومت قائم کی، جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کے خصائص مٹ گئے تھے، ان کو اُجاگر کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، اس لازوال ثروت میں ہر اس شخص کا اضافہ تسلیم کیا جائے گا، جس نے اس دین پر اس کے مآخذ اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سر نو استوار کیا، نووارد فلسفوں کا ابطال کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی، اور اس امت کو کسی نئے فتنہ میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لیے اس کے دین اور مصادر دین کی حفاظت کی، حدیث و فقہ کی تدوین جدید کا کام انجام دیا، اجتہاد کا دروازہ کھولا اور امت کو تشریع کا خزانۂ عامرہ اور زندگی و

معاشرہ کا منظم قانون عطا کیا، جس نے معاشرہ میں احتساب کا فرض ادا کیا، اور اس کے انحراف اور کج روی پر کھل کر تنقید کی، اور صحیح و حقیقی اسلام کی برملا و آشکارا دعوت دی، جس نے شکوک و شبہات کے دور اور اضطراب عقائد کے زمانہ میں علمی طرز استدلال اختیار کر کے دماغوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی، جس نے دعوت و تذکیر اور انذار و تبشیر میں انبیا علیہم السلام کی نیابت کی اور ایمان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلۂ جوالہ کی حرارت و حرکت بخشی، جس نے مادہ پرستی کے تند و تیز دھارے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی تیزی و بلاخیزی کم کی اور خدا کی مخلوق کو اس دھارے میں بہہ جانے یا اس میں دب جانے سے محفوظ رکھا، جس نے اس امت کی سیاسی قوت کی حفاظت کی اور اس کو پے درپے خارجی حملوں کو سہار لینے کی قوت عطا کی، جس نے اپنی حکیمانہ دعوت اور اپنے دامِ محبت سے اس دشمن کو شکار کیا، جو زورِ شمشیر اور نوکِ خنجر سے بھی زیر نہ ہو سکا تھا، اور جس نے عالم اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا، جس نے اپنے طاقت ور ایمان اور اپنی روحانی قوت سے ایسے دشمنوں کو حظیرۂ اسلام میں داخل کیا اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کا شرف بخشا، جس نے اپنے طاقتور ادب اور دل گداز و بلیغ اشعار سے ان ذہنوں کو اسیر دام کیا جو علمی مباحث اور مذہبی فلسفوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے، یہ پورا ایک سلسلہ ہے اور اس میں ہر شخصیت کا ایک خاص حصہ اور مرتبہ ہے، تاریخ دراصل امانت کی ادائیگی اور حق شناسی اور اعترافِ حقیقت کا نام ہے ان میں ہر شخص اسلام کی کسی نہ کسی سرحد کا محافظ اور اسلام کے ترکش کا ایک قیمتی تیر تھا، اگر ان لوگوں کی مخلصانہ کوششیں نہ ہوتیں، جن کو آج ہم تاریخ کی دوربین سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو ہم تک یہ مجموعہ نہ پہونچ پاتا جس میں ہمارے لیے عزت، عبرت اور موعظت کا وافر سامان موجود ہے۔ اور جس کی موجودگی میں ہم اقوام عالم کے سامنے بجا طور پر اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں۔

آئندہ صفحات میں امام غزالیؒ کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے قارئین اس نابغہ روزگار شخصیت کی دعوت وعزیمت اور تجدید واصلاح کے کارناموں سے بخوبی آگاہ ہو سکیں گے۔[1]

ابوالحسن علی ندوی

1 اضافہ از ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام غزالیؒ

تعلیم اور علمی عروج

امام غزالیؒ کا نام محمد، کنیت ابو حامد، والد کا نام بھی محمد تھا، طوس کے ضلع میں ۴۵۰ھ طاہران میں پیدا ہوئے، والد کی وصیت کے مطابق جو ایک مخلص علم دوست اور غریب مسلمان تھے، ان کے ایک صوفی دوست نے تعلیم کا انتظام کرنے سے معذرت کی، اور کسی مدرسہ میں داخل ہو جانے کا مشورہ دیا، چنانچہ وہ ایک مدرسہ میں داخل ہو کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔

امام غزالیؒ نے اپنے وطن میں شیخ احمد الراذکانی سے فقہ شافعی حاصل کی پھر جرجان میں امام ابو نصر اسماعیلی سے پڑھا، اس کے بعد نیشاپور جاکر امام الحرمین کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے رفقاء میں جو ۴۰۰ کی تعداد میں تھے، ممتاز ہو گئے اور اپنے نامور استاد کے نائب (معید) بن گئے، امام الحرمین ان کی تعریف میں فرماتے تھے کہ غزالی بحر زخار ہے، امام الحرمین کے انتقال کے بعد نیشاپور سے نکلے، اس وقت ان ی عمر ۲۸ سال کی تھی، لیکن بڑے بڑے کبیر السن علماء سے وہ زیادہ ممتاز اور باکمال سمجھے جاتے تھے۔

درس و تدریس سے فارغ ہونے کے بعد امام غزالیؒ نظام الملک کے دربار میں پہنچے، نظام الملک نے ان کی شہرت اور ممتاز قابلیت کی بناء پر بڑے اعزاز و اکرام سے دربار میں ان کو لیا، یہاں اہل کمال کا مجمع تھا، علمی مباحثے اور دینی مناظرے درباروں اور مجلسوں یہاں تک کہ تقریبات شادی و غمی کا ایک ضروری عنصر تھے۔ امام غزالیؒ ان مباحث میں سب پر غالب رہتے تھے، ان کی نمایاں قابلیت دیکھ کر نظام الملک نے ان کو مدرسہ نظامیہ کی صدارت کے

لیے انتخاب کیا جو اس وقت ایک عالم کے لیے سب سے بڑا اعزاز اور منتہائے ترقی تھا، اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال سے زیادہ نہ تھی، ۴۸۴ھ میں وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئے اور نظامیہ میں درس شروع کیا، تھوڑے ہی دن میں ان کے درس، حسن تقریر، اور تبحر علمی کی بغداد میں دھوم مچ گئی، طلبہ و علماء نے استفادہ کے لیے ہر طرف سے ہجوم کیا، ان کی مجلس درس مرجع خلائق بن گئی، تین تین سو منتہی طالب علم اور سو سو امراء و روساء اس میں شرکت کرتے تھے، رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی عالی دماغی، علمی فضیلت اور طاقتور شخصیت سے بغداد میں ایسا اثر و رسوخ پیدا کر لیا کہ ارکانِ سلطنت کے ہمسر بن گئے اور بقول ایک معاصر (شیخ عبدالغافر فارسی) ان کے جاہ و جلال کے سامنے امراء اور وزراء اور خود بارگاہِ خلافت کی شان و شوکت بھی ماند پڑ گئی،[1] یہاں تک کہ ۴۸۵ھ میں ان کو خلیفۂ عباسی (مقتدی باللہ) نے ملک شاہ سلجوقی کی بیگم ترکان خاتون کے پاس (جو اس وقت سلطنت کی مالک تھی) اپنا سفیر بنا کر بھیجا، خلیفۂ مستظہر جو مقتدی باللہ کا جانشین تھا، امام سے خاص ربط و ارادت رکھتا تھا، اس کی فرمائش سے امام غزالیؒ نے باطنیہ کے رد میں کتاب لکھی، اور اس کا نام خلیفہ کی نسبت سے "مستظہری" رکھا۔

گیارہ سال کی رہ نوردی اور اس کے تجربات

اس انتہائی عروج کا جو کسی علمی و دینی شخصیت کو حاصل ہو سکتا ہے، تقاضا تھا کہ امام غزالیؒ اس پر قناعت کریں اور اسی کے دائرہ کے اندر پوری زندگی گزار دیں، جیسا کہ ان کے بعض اساتذہ نے کیا اور لوگ عموماً کیا کرتے ہیں مگر ان کی بے چین طبیعت اور بلند حوصلہ طائر ہمت اس بلندی پر راضی نہ تھا، اور دراصل اسی بلند ہمتی نے ان کو "امام" اور "حجۃ الاسلام" بنا دیا، دنیا میں جاہ و اعزاز کی قربانی اور مقصد کی دھن اور سچی لگن کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، امام غزالیؒ نے خود ان حالات و اسباب کو بیان کیا ہے جنھوں نے ان کو ایسا قدم اٹھانے پر آمادہ کیا، اور ان کو تعلیم و تدریس کے کام کا نہیں رکھا یہاں تک کہ وہ اقلیم علم

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴، ص ۱۰۷

کی بادشاہی چھوڑ کر یقینی علم اور دولت باطن کی تلاش میں نکل گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر پلٹے "المنقذ من الضلال" میں وہ لکھتے ہیں:

"عنفوانِ شباب سے میری طبیعت تحقیقات و معلومات کی طرف مائل تھی، ہر فرقہ اور جماعت سے ملتا، اور اس کے عقائد و خیالات معلوم کرتا رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقلید کی بندش ٹوٹ گئی، جو عقائد بچپن سے ذہن میں جمے ہوئے تھے، وہ متزلزل ہو گئے، میں نے خیال کیا کہ عیسائی اور یہودی بچے بھی اپنے عقائد پر پرورش پاتے ہیں، حقیقی علم تو یہ ہے کہ کسی قسم کے شبہہ کا احتمال تک نہ رہ جائے، مثلاً مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دس کا عدد تین سے زائد ہوتا ہے، اگر کوئی شخص کہے نہیں بلکہ تین زائد ہے، اور میرے دعویٰ کی دلیل ہے کہ لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھا بھی دے تب بھی مجھے اپنے علم میں کوئی شک نہیں ہو گا، مجھے اس پر تعجب ضرور ہو گا لیکن پھر بھی میرا یقین باقی رہے گا کہ دس تین سے زائد ہے، میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کا یقینی علم صرف حسیات اور بدیہات کے دائرہ میں ہے، لیکن جب زیادہ کدو کاوش سے کام لیا تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی شک کی گنجائش ہے، میں نے دیکھا کہ حواس میں سب سے زیادہ قوی حاسہ بصارت کا ہے، لیکن اس میں غلطی ہوتی ہے، میرا یہ شک یہاں تک بڑھا کہ مجھے محسوسات کے یقینی ہونے کا اطمینان نہیں رہا، پھر میں نے عقلیات پر غور کیا تو وہ مجھے حسیات سے بھی زیادہ مشکوک اور کمزور نظر آئے، تقریباً دو مہینہ تک میری یہ ارتیابی کیفیت رہی اور مجھ پر سوفسطائیت کا غلبہ رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفا دی اور طبیعت صحت و اعتدال پر آ گئی، اور بدیہاتِ عقلی پر اطمینان پیدا ہو گیا، لیکن یہ کسی استدلال اور ترتیب کی بنا پر نہ تھا، بلکہ

ایک وجدانی اور وہبی بات تھی، اس مرض سے شفا پانے کے بعد اب میرے سامنے چار گروہ تھے، جو طالب حق معلوم ہوتے تھے، متکلمین جو اہلِ عقل و نظر ہونے کے مدعی تھے، باطنیہ جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خاص تعلیمات و اسرار ہیں اور انھوں نے براہ راست امام معصوم سے علم حقائق حاصل کیا ہے، فلاسفہ جن کا کہنا ہے کہ وہی اہلِ منطق و اہلِ استدلال ہیں، صوفیہ جو اپنے کو صاحبِ کشف و شہود کہتے ہیں، میں نے ہر ایک گروہ کی کتابوں اور خیالات کا مطالعہ کیا تو کسی سے بھی مطمئن نہیں ہوا، علم کلام کے متعلق اس فن کے محققین کی تصنیفات پڑھیں اور خود بھی اس موضوع پر تصنیفات کیں، میں نے دیکھا کہ اگرچہ یہ فن اپنے مقصود کو پورا کرتا ہے لیکن میری تسلی کے لیے وہ کافی نہیں، کیونکہ اس میں ایسے مقدمات پر بنا رکھی گئی ہے، جو فریقِ مقابل کے پیش کیے ہوئے ہیں، اور متکلمین نے ان کو محض تقلیداً تسلیم کر لیا ہے، یا اجماع یا قرآن و حدیث کے نصوص ہیں، اور یہ چیزیں اس شخص کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کارآمد نہیں، جو بدیہیات کے سوا کچھ اور تسلیم نہ کرتا ہو، فلسفہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے لیے پہلے میں نے اس کا تحقیقی مطالعہ ضروری سمجھا، اگرچہ مجھے تصنیف و تدریس کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی، میرے حلقہ درس میں بغداد میں تین تین سو طالب علم ہوتے تھے، پھر بھی میں نے اس کے لیے وقت نکالا اور دو سال کے اندر اندر میں نے ان کے تمام علوم کا مطالعہ کر ڈالا، پھر تقریباً ایک سال تک ان پر غور و فکر کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے علوم چھ قسم کے ہیں، ریاضیات، منطقیات، طبیعیات، سیاسیات، اخلاقیات اور الٰہیات، ابتدائی پانچ علوم کا مذہب سے نفیاً و اثباتاً کچھ تعلق نہیں اور نہ مذہب

کے اثبات کے لیے ان کے انکار کی ضرورت ہے، طبیعیات میں ان کے بعض نظریات کا کہیں کہیں مذہب سے تصادم ہوتا ہے، مگر وہ چند چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں اصولاً یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ طبیعت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ خود مختار نہیں، البتہ جو لوگ ان علوم و مضامین میں فلاسفہ کی ذہانت اور باریک بینی دیکھتے ہیں وہ عمومی طور پر ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تمام علوم میں ان کا یہی حال ہوگا، حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ایک فن میں ماہر ہو، وہ ہر فن میں ماہر ہو، پھر جب ان کی بے دینی اور ان کے انکار کو دیکھتے ہیں تو محض تقلیداً وہ بھی دین کا انکار و استخفاف کرنے لگتے ہیں، دوسری طرف اسلام کے بعض نادان دوست فلاسفہ کے ہر نظریہ اور ہر دعویٰ کی تردید اپنا فرض اور اسلام کی خدمات سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ طبیعیات کے سلسلہ میں ان کی تمام تحقیقات کا بھی انکار کرنے لگتے ہیں، اس کا ایک مضر اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علمی نظریات و تحقیقات کی صداقت کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک وہ چیزیں پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں، ان کا اعتقاد خود اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جاتا ہے اور بجائے فلسفہ کے انکار کرنے کے وہ اسلام سے بدگمان ہو جاتے ہیں، لے دے کر جو فن مذہب سے متصادم ہوتا ہے، وہ الٰہیات ہے، اسی میں انھوں نے زیادہ تر ٹھوکریں کھائی ہیں، درحقیقت انھوں نے منطق میں جو شرطیں رکھی تھیں، ان کو وہ الٰہیات میں نباہ نہیں سکے، اسی لیے اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ غرض میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ فلسفہ سے میری تشفی نہیں ہوگی اور عقل تنہا تمام مقاصد کا احاطہ نہیں کر سکتی، اور نہ تمام مشکلات کی نقاب کشائی کر سکتی ہے، رہے باطنیہ تو مجھے اپنی کتاب ''مستظہری'' کی

تالیف کے سلسلہ میں ان کے مذہب کے مطالعہ کرنے کا اچھی طرح موقع ملا، میں نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا دار و مدار امامِ وقت کی تعلیم پر ہے، لیکن امامِ وقت کا وجود اور اس کی صداقت خود محتاج دلیل ہے اور یہ دونوں حد درجہ مشتبہ ہیں، اب صرف تصوف باقی رہ گیا، میں ہمہ تن تصوف کی طرف متوجہ ہوا، تصوف علمی بھی ہے، عملی بھی ہے، میرے لیے علم کا معاملہ آسان تھا، میں نے ابو طالب مکی کی "قوت القلوب" اور حارث محاسبی کی تصنیفات اور حضرت جنید شبلی و بایزید بسطامی وغیرہ کے ملفوظات پڑھے، اور علم کے راستے سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا، وہ میں نے حاصل کر لیا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اصلی حقائق تک تعلیم کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ ذوق و حال اور حالات کی تبدیلی سے پہنچا جا سکتا ہے، جو علوم میرا سرمایہ تھے خواہ وہ شرعی ہوں یا عقلی، ان سے مجھے وجودِ باری، نبوت اور معاد پر ایمانِ راسخ حاصل ہو چکا تھا، لیکن یہ بھی کسی دلیل محض سے نہیں، بلکہ ان اسباب و قرائن اور تجربوں کی بنا پر جن کی تفصیل مشکل ہے، مجھ پر یہ اچھی طرح سے واضح ہو چکا تھا کہ سعادتِ اُخروی کی صورت صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ کردارِ فانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان و کشش اور پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے ذریعہ قلب کا علاقہ دنیا سے ٹوٹ جائے، لیکن یہ جاہ و مال سے اعراض، اور موانع و علائق سے فرار کے بغیر ممکن نہیں، میں نے اپنے حالات پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سر تاپا علائق دنیوی میں غرق ہوں۔ میرا سب سے افضل عمل تدریس و تعلیم کا معلوم ہوتا تھا لیکن ٹٹولنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم پر ہے، جو نہ تو اہم ہیں اور نہ آخرت کے

سلسلہ میں کچھ فائدہ پہنچانے والے ہیں، میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص لوجہ اللہ نہ تھی، بلکہ اس کا باعث و محرک بھی محض طلب جاہ و حصولِ شہرت تھا، تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوا ہوں، اگر میں نے اصلاحِ حال کی کوشش نہ کی تو میرے لیے سخت خطرہ ہے۔ میں ایک عرصہ تک اس سب کو چھوڑ دینے اور بغداد سے نکل جانے کا ارادہ کرتا رہا لیکن اس کا فیصلہ نہ کر سکا چھ مہینے اسی کوشش میں گذر گئے کہ کبھی تو دنیاوی خواہشات کشش کرتیں اور کبھی ایمان کا منادی پکارتا کہ کوچ قریب ہے، تھوڑی عمر باقی ہے، طویل سفر درپیش ہے اور یہ سب علم و عمل محض ریا و تخیلات ہیں۔ کبھی نفس کہتا کہ یہ عارضی حالت ہے، اللہ نے جو کچھ جاہ و عزت دے رکھی ہے چھوڑنے کے بعد اگر پھر واپس آنے کا خیال ہوا تو اس کا دوبارہ حصول مشکل ہے۔ غرض اسی لیت و لعل میں چھ مہینے گذر گئے، یہاں تک کہ اب معاملہ بس سے باہر ہو گیا، زبان بھی رک گئی، جیسے اس میں تالا پڑ گیا ہو، میں کوشش کرتا تھا کہ آنے جانے والوں کی خوشی کے لیے ایک ہی دن پڑھاؤں لیکن زبان بالکل ساتھ نہیں دیتی تھی، اور ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا، زبان کی بندش سے قلب میں ایک رنج و غم کی کیفیت پیدا ہوئی جس کے اثر سے قوت ہاضمہ نے بالکل جواب دے دیا، کھانے پینے کی خواہش بالکل جاتی رہی، یہاں تک کہ ایک گھونٹ پانی، کھانے کے ایک لقمہ کا ہضم کرنا بھی میرے لیے دشوار ہو گیا، رفتہ رفتہ تمام قوائے جسمانی پر ضعف کا غلبہ ہوا یہاں تک کہ اطبا نے علاج سے ہاتھ اٹھا لیا اور کہاں کہ قلب پر کوئی اثر ہے، اور اس سے مزاج متاثر ہو گیا ہے، جب تک قلب سے یہ اثر نہ جائے، اس وقت تک علاج کچھ سود مند نہیں۔

جو میں نے دیکھا کہ میں اس معاملہ میں بالکل بے بس ہوں تو میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور اضطراری کیفیت کے ساتھ اس سے دعا کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جاہ و مال اور اہل و عیال کا چھوڑ دینا مجھے آسان معلوم ہونے لگا۔ میں نے مکہ کا قصد ظاہر کیا، اور میرے دل میں یہ تھا کہ میں شام کا سفر کروں گا اور بڑے لطائف الحیل سے میں نے بغداد سے نکلنے کا سامان کیا، اہلِ عراق کو جب میرا قصد معلوم ہوا تو انھوں نے چاروں طرف سے مجھے ملامت کرنی شروع کی اس لیے کہ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس ترک و انقطاع کا کوئی دینی سبب بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ ان کے خیال میں مجھے دین کا بلند ترین منصب حاصل تھا "ذَالِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ" پھر لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع کیں۔ جو مرکزِ حکومت سے دور تھے انھوں نے خیال کیا کہ اس میں کچھ حکام کا اشارہ ہے اور ان کے ایما سے یہ خدمت ترک کی جارہی ہے لیکن جن لوگوں کا حکومتی حلقوں سے تعلق تھا، وہ دیکھتے تھے کہ اہلِ حکومت کو کس قدر میرے قیام پر اصرار ہے، اور ان کی کیسی شدید خواہش ہے کہ میں اپنے کام میں مشغول رہوں، وہ یہ کہتے تھے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی اس رونق اور علمی چہل پہل کو کسی کی نظر لگ گئی ہے کہ یہ شخص سب چھوڑ چھاڑ کر جا رہا ہے، غرض میں نے بغداد کو الوداع کہا اور جو کچھ میرے پاس مال و متاع تھا، اس میں سے بقدر کفاف رکھ کر سب بانٹ دیا، بغداد سے میں شام آیا، اور وہاں دو سال کے قریب رہا، وہاں میرا کام عزلت و خلوت اور مجاہدے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے علم تصوف سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کے مطابق نفس کے تزکیہ، اخلاق کی درستی و تہذیب اور ذکر اللہ کے لیے

اپنے قلب کو مصفا کرنے میں مشغول رہا، میں مدت تک دمشق کی جامع مسجد میں معتکف رہا، مسجد کے منارے پر چڑھ جاتا اور تمام دن دروازہ بند کیے وہیں بیٹھا رہتا، دمشق سے میں بیت المقدس آیا، وہاں بھی روزانہ صخرہ کے اندر چلا جاتا، اور دروازہ بند کر لیتا، سیدنا ابراہیمؑ کی زیارت کے بعد میری طبیعت میں حج و زیارات کا شوق اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے برکات سے استفادہ کا خیال ہوا، چنانچہ میں حجاز گیا، حج کرنے کے بعد اہل و عیال کے افکار اور معاشی ضرورتیں طبیعت میں انتشار پیدا کرتی رہتی تھیں، اور دلجمعی اور سکونِ قلب مسلسل نہیں رہتا تھا، لیکن میں اس سے مایوس نہیں ہوتا تھا، اور وقتاً فوقتاً اس سے لذت یاب ہوتا رہتا تھا۔ دس برس اسی حالت میں گذر گئے۔ ان تنہائیوں میں مجھے جو انکشافات ہوئے اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا، اس کی تفصیل اور اس کا استقصاء تو ممکن نہیں لیکن ناظرین کے نفع کے لیے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ صوفیاہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں۔ ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں۔ اگر عقلآء کی عقل، حکماء کی حکمت، اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، ان کی تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں، جس سے روشنی حاصل کی جائے"۔

خلوت سے جلوت کی طرف

ممکن تھا کہ امام غزالیؒ اس خلوت و عزلت کی حالت میں رہ جاتے اور بقیہ عمر بھی روحانی لذت اور یکسوئی کے سکون و اطمینان میں گذار دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے جو

عظیم الشان کام لینا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس خلوت سے نکلیں اور درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور اجتماعی زندگی اختیار کریں تاکہ خلائق کو نفع ہو، الحاد و فلسفہ کی تردید اور عقلی و علمی طور پر اسلام کی برتری اور صداقت ثابت کرنے کے لیے خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یقین و مشاہدے کے مقام تک پہنچادیا تھا، عالم اسلام میں ان سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں تھی، چونکہ یہ کام خدا کو منظور تھا، اور اسلام کو اس کی سخت ضرورت تھی اس لیے خود ان کی طبیعت میں اس کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوا اور ان پر اس چیز کا غلبہ ہوا کہ یہی عزیمت کا کام اور انبیاء علیہم السلام کی نیابت اور وقت کا فریضہ اور افضل عبادت ہے، اپنے ان احساسات کو وہ خود بیان کرتے ہیں اور خلوت سے جلوت میں آنے کا سبب تحریر کرتے ہیں:

"میں نے دیکھا کہ فلسفہ کے اثرات بہت سے مدعیان تصوف کی گمراہی، بہت سے علماء کی بے عملی اور متکلمین کی غلط اور کمزور نمائندگی کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے اور عقائد پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے، بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند بھی ہیں لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے بعض لوگ محض جسمانی ورزش کے خیال سے نماز پڑھتے، بعض محض سوسائٹی، اہل شہر کی عادت کی پیروی، اور اپنی حفاظت کے لیے، بعض احکام شرعی کی مادی منفعتیں اور ان کے نہ کرنے کے دنیاوی نقصانات بتلاتے ہیں، اور اگر ان نقصانات سے بچا جاسکے تو ان کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، میں نے دیکھا کہ میں ان شبہات کے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور بآسانی اس پر قادر ہوں، یہاں تک کہ ان لوگوں کی پردہ دری مجھے اپنے مطالعہ اور ان کے علوم سے گہری واقفیت کی وجہ سے پانی پینے سے بھی زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے، یہ دیکھ کر میرے دل میں شدت سے خیال پیدا ہوا کہ مجھے

یہی کام کرنا چاہیے اور یہی وقت کا فریضہ ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا تھا کہ تجھے یہ خلوت و عزلت کب جائز ہے، مرض پھیل گیا ہے اور طبیب خود بیمار ہیں، اللہ کی مخلوق ہلاکت کے کنارے پہنچ گئی ہے، پھر میں نے کہا کہ یہ عظیم الشان کام تم سے کیسے انجام پاسکے گا، عہدِ نبوت سے بہت بُعد ہو گیا ہے، باطل کا ہر طرف دور دورہ ہے، اگر تم نے خلقِ خدا کو ان کی محبوب و مانوس چیزوں سے ہٹانے کی کوشش کی تو سارا زمانہ تمہارا مخالف ہو جائے گا۔ تم تنہا کیسے ان کا مقابلہ کر سکو گے۔ اور کیسے زندگی بسر کرو گے، یہ تو جب ممکن تھا کہ زمانہ مساعد ہوتا، اور سلطانِ وقت دین دار اور صاحبِ اقتدار ہوتا۔ میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھالیا اور اپنے لیے عزلت و خلوت کی زندگی کو جائز قرار دے لیا، لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا، اس نے سلطانِ وقت کے دل میں خود ہی تحریک پیدا کر دی، اس نے مجھے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لیے نیشاپور پہنچنے کا تاکیدی حکم دیا، یہ حکم سلطانی کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی تعمیل نہ کی تو ناراضی تک نوبت پہنچے گی، میں نے خیال کیا کہ اب میرے لیے عذر باقی نہیں رہا۔ اب میری گوشہ نشینی اور خلوت پسندی محض سستی اور راحت طلبی اور تن آسانی کے لیے ہو گی اور آزمائش اور تکالیف سے گریز، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ

نیز اپنے رسولِ کریم سے جو اس کے بندوں میں سب سے معزز و مکرم تھے، اس کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا

حَتّٰی اَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰهِ وَ لَقَدْ جَآءَ کَ مِنْ نَّبَاءِ الْمُرْسَلِیْنَ

میں نے چند اہلِ قلوب اور اہلِ مشاہدات سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا، انھوں نے بھی بالاتفاق مجھے ترکِ عزلت کا مشورہ دیا، اس کی تائید میں بہت سے صلحاء نے متواتر خواب بھی دیکھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ میرا یہ اقدام بڑی خیر و برکت کا باعث ہوگا، اور پانچویں صدی کے شروع میں جس میں ایک ہی مہینہ باقی تھا، شاید کوئی عظیم الشان تجدیدی کام ہوگا، اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے آدمی پیدا کرتا ہے، جو اس امت کے دین کو تازہ کر دیتا ہے۔ ان سب آثار و قرائن سے مجھے بھی اس کی امید پیدا ہوئی، اللہ تعالیٰ نے میرے لیے نیشاپور کا سفر کر دیا اور میں نے اس کارِ عظیم کا ارادہ کر لیا۔ یہ ۴۹۹ھ کے ماہ ذیقعدہ کا قصہ ہے، بغداد سے ذیقعدہ ۴۸۸ھ میں نکلا تھا اس طرح سے میری گوشہ نشینی کی مدت ۱۱ سال ہوتی ہے، یہ سب تقدیر الٰہی کی کارفرمائی تھی، جس طرح بغداد سے نکلنا اور وہاں کے جاہ و اعزاز کو خیرباد کہنا تصور میں نہیں آتا تھا لیکن اللہ کے حکم سے وہ سب کچھ آسان ہو گیا، اسی طرح سے اس عزلت کے زمانہ میں خلوت سے جلوت کی طرف دوبارہ آنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن وقت پر اس کا بھی سامان ہو گیا"۔

غرض ذیقعدہ ۴۹۹ھ میں امام صاحب نے پھر نیشاپور کا رخ کیا، اور مدرسہ نظامیہ کی مسندِ درس کو زینت دی اور دوبارہ تدریس و افادہ کا کام شروع کیا، لیکن اب امام غزالیؒ کے درس و تدریس اور اصلاح و ارشاد اور اس انقلاب سے پہلے کے تدریسی مشاغل اور وعظ و ارشاد میں فرق تھا، پہلے وہ نفس کے تقاضے اور طبیعت کے جذبہ سے کرتے تھے، اب وہ اپنے کو مامور اور آلۂ کار سمجھتے تھے، چنانچہ خود پوری صاف گوئی سے لکھتے ہیں:

"مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ علم کی نشر و اشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے، لیکن در حقیقت اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے، میری اس پہلی اور دوسری حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا جو حصولِ جاہ کا ذریعہ ہے، اور میں اپنے قول و عمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا، اور یہی میرا مقصود و نیت تھی، لیکن اب میں اس علم کی دعوت دیتا ہوں جس سے جاہ سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہنچوں گا، یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہو جائے گا، لیکن اپنے یقین و مشاہدہ کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے، اسی سے آدمی گمراہی اور شر سے بچ سکتا ہے، اور ہدایت و طاعت کی طاقت حاصل کر سکتا ہے۔ دراصل میں نے اپنی طرف سے حرکت نہیں کی، اللہ مجھے حرکت میں لایا ہے، میں نے خود کام نہیں شروع کیا ہے اللہ نے مجھے کام میں لگایا ہے۔ میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح ہو، پہلے مجھے راہ پر لگائے پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے، حق مجھ پر منکشف ہو جائے اور اس کے فضل سے مجھے اتباع کی توفیق ہو، باطل مجھ پر واضح کر دے، اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے"[1]۔

امام غزالیؒ کا تجدیدی کام

امام غزالیؒ نے اس کے بعد جو مجددانہ کام انجام دیا، اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1 المنقذ من الضلال ص ۲۸ تا ۳۰ مختصراً

۱: فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے ان کی بنیادوں پر حملہ۔

۲: زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ اور ان کی تنقید و اصلاح۔

فلسفہ پر عملِ جراحی

ان کے پہلے اور سب سے بڑے کارنامہ کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفہ الحاد، باطنیت کے خلاف اس وقت تک جو کچھ کیا جاتا رہا تھا، اس کی حیثیت صرف مدافعت و جواب دہی کی تھی، اس وقت تک فلسفہ اسلام پر حملہ آور تھا، اور متکلمین اسلام، صفائی کے وکیل تھے۔ فلسفہ اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتا تھا اور علم کلام سپر بننے کی کوشش کرتا تھا اس وقت تک متکلمین و علماء اسلام کے گروہ میں کسی نے خود فلسفہ کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی جرأت نہیں کی۔ "فلسفہ" جن "مفروضات" پر قائم تھا، ان پر جرح کرنے اور خود ان کی علمی تنقید کرنے کی صدیوں تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی۔ امام ابوالحسن اشعری کو چھوڑ کر جن کو فلسفہ سے براہِ راست واسطہ نہیں پڑا۔ پورے علم کلام کا لہجہ معذرت آمیز اور مدافعانہ تھا، امام غزالیؒ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے فلسفہ کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کیا، اس کے بعد "مقاصد الفلاسفہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں آسان زبان اور سلجھے ہوئے طریقہ پر منطق، الٰہیات اور طبیعیات کا خلاصہ پیش کیا اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ فلاسفہ کے نظریات، اور مباحث کو مدون کر دیا، کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے وضاحت کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ ریاضیات[۱] میں قیل و قال کی گنجائش نہیں، اور دین کا اس سے نفیاً و اثباتاً کوئی تعلق نہیں، لیکن اصل مذہب کا تصادم الٰہیات سے ہے۔ منطقیات[۲] میں بھی شاذ و نادر غلطیاں ہیں، اگر کچھ اختلاف ہے تو اصطلاحات کا، طبیعیات[۳] میں ضرور حق و باطل کی آمیزش ہے، اس لیے ان کا موضوعِ بحث دراصل الٰہیات اور کسی قدر طبیعیات ہے، منطق محض تمہید و اصطلاحات کے لیے۔

اس کتاب سے فارغ ہو کر جس کی علم کلام کے حلقہ میں سخت ضرورت تھی، انھوں نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "تہافت الفلاسفۃ" لکھی جس کی خاطر انھوں نے "مقاصد

الفلاسفہ" لکھی تھی، اس میں انھوں نے فلسفہ کے الٰہیات و طبیعیات پر اسلامی نقطہ نظر سے تنقید کی، اور اس کی علمی کمزوریوں، اس کے استدلال کے ضعف، اور فلاسفہ کے باہم تناقض و اختلاف کو پوری جرأت و قوت کے ساتھ ظاہر کیا، اس کتاب میں ان کا لہجہ پُر از اعتماد ان کی زبان طاقت ور اور شگفتہ ہے۔ کہیں کہیں وہ طنزیہ اور شوخ طرزِ بیان بھی اختیار کر لیتے ہیں جس کی فلسفہ سے مرعوب حلقوں میں ضرورت تھی، اور جو بڑا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف فلاسفہ کے مقابلہ میں احساس کہتری کے ہر شائبہ سے پاک اعتماد اور یقین سے لبریز اور فلاسفہ سے بالکل غیر مرعوب ہے، وہ فلاسفہ یونان کو اپنی صف اور سطح کا آدمی سمجھتا ہے، اور ان سے مساویانہ و حریفانہ باتیں کرتا ہے، اس وقت ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی، جو فلسفہ سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے، اور بجائے مدافعت اور جواب دہی کے فلسفہ پر پورا وار کرے، امام غزالیؒ نے "تہافت الفلاسفہ" میں یہی خدمت انجام دی ہے، اول سے آخر تک اس کتاب میں ان کا طرز یہی ہے، کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں۔

"ہمارے زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے، یہ لوگ مذہبی احکام و قیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے سقراط و بقراط، افلاطون و ارسطو کے پر ہیبت نام سنے، اور ان کی شان میں ان کے مقلدوں کی مبالغہ آرائیاں اور قصیدہ خوانی سنی، ان کو معلوم ہوا کہ ریاضیات، منطقیات، طبیعیات، و الٰہیات میں انھوں نے بڑی موشگافیاں کی ہیں، اور ان کا عقل و ذہن میں کوئی ہمسر نہ تھا، اس عالی دماغی اور ذہانت کے ساتھ وہ مذاہب اور ان کی تفصیلات کے منکر تھے، اور ان کے نزدیک ان کے اصول و قواعد فرضی و مصنوعی ہیں، بس انھوں نے بھی تقلید انکارِ مذہب کو اپنا شعار بنا لیا، اور تعلیم یافتہ اور روشن خیال کہلانے کے شوق میں مذاہب کا

انکار کرنے لگے، تا کہ ان کی سطح عوام سے بلند سمجھی جائے اور وہ بھی عقلاء و حکما کے زمرہ میں شامل ہونے لگیں، اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکمانے الٰہیات پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچۂ اطفال اور ان کے بہت سے اقوال و نظریات حد درجہ کے مضحکہ خیز بلکہ عبرت انگیز ہیں۔[1]

اس کتاب میں آگے چل کر ان کا زور بیان اور طنز آمیز طریقہ تحریر اور شوخ ہو جاتا ہے اور ذات وصفات باری کے متعلق فلاسفہ کے عجائبات اور عقول و افلاک کا پورا شجرۂ نسب لکھ کر جو فلاسفہ نے تصنیف کیا ہے لکھتے ہیں:

قلنا ما ذکرتموہ تحکمات و ھی علی التحقیق ظلمات فوق ظلمات لو حکاہ الانسان عن منام رأہ لاستدل علی سوء مزاجہ[2]

تمہارا یہ سارا بیان اور تفصیلات محض دعاوی اور تحکمات ہیں بلکہ درحقیقت تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا ایسا خواب بھی دیکھنا بیان کرے تو اس کے سوءِ مزاج کی دلیل ہوگی

آگے چل کر لکھتے ہیں:

لست ادری کیف یقنع المجنون من نفسہ بمثل ھذہ الاوضاع فضلاً عن العقلاء الذین یشقون الشعر بزعم فی المعقولات[3]

مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے، چہ جائیکہ وہ

1 تہافت الفلاسفہ ص ۲-۳ مطبع علامیہ مصر

2 ایضاً ص ۲۹-۳۰

3 ایضاً ص ۳۳

عقلاء جو بزعم خود معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

انتھیٰ بھم التعمق فی التعظیم الیٰ ان ابطلوا کل ما یفھم من العظمۃ و قربوا حالہ من حال المیت الذی لا خبر لہ بما یجری فی العالم الا انہ فارق المیت فی شعورہ بنفسہ فقط، وھٰکذا یفعل اللہ بالزائغین عن سبیلہ والناکبین عن طریق الھدیٰ المنکرین لقولہ تعالیٰ ما اشھدتھم خلق السمٰوٰتِ والارض ولا خلق انفسھم'' الظانین باللہ ظن السوء المعتقدین ان امور الربوبیۃ تستعلی علی کنھھا القوی البشریۃ المغرورین بعقولھم زاعمین انّ فیھا مندوحۃ عن تقلید الرسل واتباعھم فلا جرم اضطروا الی الاعتراف بان لباب معقولا تھم رجع الیٰ مالوحکی فی المنام لتعجب منہ[1]

(مبدا اول) کی تعظیم میں مبالغہ کرنے نے ان کو اس حد تک پہنچا دیا کہ انھوں نے عظمت کے تمام شرائط و لوازم کو باطل قرار دے دیا اور اللہ تعالیٰ کو (اپنے فلسفہ میں) اس مردہ کی طرح بنا دیا جس کو کچھ خبر نہیں کہ عالم میں کیا ہو رہا ہے، صرف اس بات میں وہ مردہ سے غنیمت ہے کہ اس کو اپنا شعور ہے (مردہ کو اپنا شعور بھی نہیں ہوتا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ایسا ہی حشر کرتا ہے، جو اس کے راستہ سے ہٹ جاتے ہیں اور ہدایت کے راستہ سے کترا جاتے ہیں جو اس آیت کے منکر ہیں ''میں نے ان کفار و مشرکین کو آسمان اور زمین کی پیدائش کے وقت گواہ نہیں بنایا، اور نہ ان کی پیدائش کے وقت جو اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کرتے ہیں اور برا اعتقاد رکھتے ہیں جن کا خیال ہے کہ امور

---

[1] تہافت الفلاسفہ ص ۳۱

ربوبیت کی حقیقت پر انسانی قویٰ حاوی ہو سکتے ہیں، جو اپنی عقلوں پر نازاں ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں پیغمبروں کی تقلید اور ان کے اتباع کی ضرورت نہیں، لامحالہ اس کا انجام یہ ہوا کہ ان کی زبان سے معقولات کے نام سے ایسی ایسی مضحکہ خیز باتیں نکلیں کہ اگر کوئی خواب بھی ایسا بیان کرے تو لوگ تعجب کریں۔

"تہافت الفلاسفہ" کا اثر

فلسفہ پر دلیرانہ تنقید اور کسی حد تک تحقیر علم کلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا' جس کا سہرا امام غزالیؒ کے سر ہے' بعد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس کی تکمیل کی اور فلسفہ اور منطق کی لاش کی "تشریح" (پوسٹ مارٹم) کا فرض انجام دیا' فلسفہ کی جراحی کے اس سلسلہ کا آغاز امام غزالیؒ ہی کی تصنیفات سے ہوتا ہے۔

"تہافت الفلاسفہ" نے فلسفہ کے خیالی طلسم پر کاری ضرب لگائی اور اس کی عظمت' ذہنی تقدس کو کافی نقصان پہنچایا' اس کتاب کی تصنیف نے فلسفہ کے حلقوں میں ایک اضطراب اور غم و غصہ پیدا کر دیا' مگر سو برس تک اس کے جواب میں کوئی شایانِ شان کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں فلسفہ کے مشہور پرجوش وکیل اور ارسطو کے حلقہ بگوش ابن رشد (م ۵۹۵ھ) نے "تہافت التہافت" کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ علماء مغرب کہتے ہیں کہ اگر ابن رشد فلسفہ کی حمایت کے لیے نہ کھڑا ہو جاتا تو فلسفہ غزالیؒ کے حملوں سے نیم جان ہو چکا تھا، ابن رشد کی حمایت نے اس کو سو برس تک کے لیے پھر زندگی عطا کر دی[1]۔

باطنیت پر حملہ

فلسفہ کے علاوہ امام غزالیؒ نے فتنۂ باطنیت کی طرف بھی توجہ کی انھوں نے قیام

---

1 تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی الشرق و المغرب محمد لطفی جمعہ ص ۲۷

بغداد اور مدرسہ نظامیہ کی تدریس کے زمانہ میں باطنیوں کی تردید میں خلیفۂ وقت کے اشارہ سے "المستظہری" تالیف کی تھی، جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی خود نوشت تلاش حق کی کہانی "المنقذ من الضلال" میں کیا ہے، اس کتاب کے علاوہ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں اور ہیں، جو غالباً اس بازگشت زمانہ کی تصنیف ہیں "حجۃ الحق"، "مفصل الخلاف"، "قاصم الباطنیہ"[1] ان کی تصنیفات کی فہرست میں اس موضوع پر دو کتابیں "فضائح الاباحیہ" اور "مواھم الباطنیہ" اور بھی ملتی ہیں، باطنیت کے رد کے لیے در حقیقت اہل سنت کے حلقہ میں ان سے زیادہ موزوں آدم ملنا مشکل تھا، وہ فلسفہ و تصوف اور ظاہری علوم اور حقائق و معارف دونوں کوچوں سے واقف تھے، اور باطنیہ کی اسرار فروشی اور ان کی عقلی سازش کا آسانی سے پردہ فاش کر سکتے تھے، باطنیہ کا بڑا حربہ فلسفہ اور اس کی اصطلاحات تھیں، اس لیے امام غزالیؒ جیسا جامع اور عقلیات کا مبصر شخص ہی ان کی تردید کا کام کر سکتا تھا، چنانچہ اس کام کو انھوں نے بخوبی انجام دیا اور ان کو علمی طور پر بے وقعت اور بے اثر بنا دیا۔

زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ

امام غزالیؒ کا دوسرا اصلاحی کارنامہ زندگی و معاشرت کا اسلامی جائزہ اور اس کی اصلاح و تجدید کی کوشش تھی، ان کی اس کوشش کا نمونہ اور کامیاب نتیجہ ان کی زندہ جاوید تصنیف "احیاء علوم الدین" ہے۔

احیاء علوم الدین

تاریخ اسلام میں جن چند کتابوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے، اور جن سے اسلامی حلقے طویل عرصہ تک متاثر رہے ہیں، ان میں "احیاء علوم الدین" کو ممتاز مقام حاصل ہے، حافظ زین الدین العراقی صاحب "الفیہ" (م۸۰۶ھ) جنھوں نے احیاء کی احادیث کی تخریج کی ہے، کہتے ہیں کہ امام غزالیؒ کی احیاء

---

[1] ان تینوں کتابوں کا تذکرہ امام غزالی نے "جواہر القرآن" میں کیا ہے

العلوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات سے ہے،[1] عبدالغافر فارسی جو امام غزالیؒ کے معاصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ "احیاء العلوم" کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی[2]۔ شیخ محمد گازرونی کا دعویٰ تھا، کہ اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیے جائیں تو میں "احیاء العلوم" سے ان کو دوبارہ زندہ کر دوں گا[3]۔ حافظ ابن جوزی نے بھی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود اس کتاب کی تاثیر اور مقبولیت کا اعتراف کیا ہے، اور اس کا خلاصہ "منہاج القاصدین" کے نام سے لکھا۔

یہ کتاب خاص حالات و کیفیات اور خاص جذبہ کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ بغداد سے انھوں نے طلب حق اور تلاشِ یقین کا جو سفر شروع کیا تھا اور جو دس برس کے مجاہدات اور بادیہ پیمائی کے بعد کامیابی پر ختم ہوا۔ احیاء العلوم اس سفر کی سوغات تھی، جو امام غزالیؒ اہلِ وطن کے لیے لائے، یہ ان کے قلبی تاثرات، علمی تجربات، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے۔

مولانا شبلی نے "الغزالی" میں لکھا ہے:

> بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا، تمام مذاہب کو چھانا کسی سے تسلی نہیں ہوئی آخر تصوف کی طرف رُخ کیا، لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی، بالکل سر تا پا حال کا کام تھا، اور اس کا پہلا زینہ اصلاح باطن اور تزکیہ نفس تھا، امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سدّ راہ تھے، قبول عام و ناموری، جاہ و منزلت، مناظرات و مجادلات اور پھر تزکیہ نفس شَتَّانَ بَيْنَهُمَا
>
> ع ایں رہ کہ می روی تو بمنزل نمی رود
>
> آخر سب چھوڑ چھاڑ کر ایک کملی پہن بغداد سے نکلے، اور دشت پیمائی

1 تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء (شیخ عبدالقادر الحسنی)
2 تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء (شیخ عبدالقادر الحسنی)
3 تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء (شیخ عبدالقادر الحسنی)

شروع کی، سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزمِ راز تک رسائی پائی، یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے لیکن

؎ بیاد آر حریفاں بادہ پیمارا

کے لحاظ سے افادۂ عام پر نظر پڑی دیکھا تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے، امیر و غریب، عام و خاص، عالم و جاہل، رند و زاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں، علماء جو دلیل راہ بن سکتے تھے، طلب جاہ میں مصروف ہیں، وہ یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے، اور اس حالت میں کتاب لکھی، دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھپالیا ہے، اور سعادتِ اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں، علماء جو دلیل راہ تھے زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا ہے، جو رہ گئے ہیں وہ نام کے عالم ہیں، جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنالیا ہے، اور جنھوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے، مناظرہ (جو فخر و نمو کا ذریعہ ہے) وعظ (جس میں عوام کی دلفریبی کے لیے رنگین اور مسجّع فقرے استعمال کیے جاتے ہیں) فتویٰ (جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے) باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے اور لوگ اس کو بھول بھلا چکے، یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور مہر سکوت ٹوٹ گئی۔[1]

تنقید و احتساب

کتاب کی تالیف سے جو اصلاح و تربیت امام غزالی کے پیش نظر تھی، اس کے لیے آمادگی اور شوق اور اپنی اور اپنے ماحول کی اصلاح کا تقاضا پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ

1 الغزالی ص ۶۳، ۶۴

ان کمزوریوں اور خرابیوں کی نشاندہی کی جائے جو علمی و دینی حلقوں اور مسلم معاشرہ میں بالعموم پھیلی ہوئی تھیں، نیز اس حقیقت کو آشکارا کیا جائے کہ نفس و شیطان نے کس کس طرح مختلف طبقوں کو فریب دے رکھا ہے، دینی مفاہیم و حقائق کس طرح تبدیل ہو گئے ہیں، لوگ حقائق و مقاصد سے ہٹ کر ظواہر و اشکال اور رسوم میں کس طرح گرفتار ہیں، اور مقصد اصلی سعادتِ اخروی اور رضائے الٰہی سے کس طرح غافل ہیں، اس کے لیے انھوں نے اپنے زمانہ کی زندگی اور معاصر سوسائٹی کا پورا جائزہ لیا اور اس کی بے لاگ تنقید کی اور ہر طبقہ کے امراض اور مغالطوں کو صفائی کے ساتھ بیان کیا، مقاصد اور وسائل و آلات میں فرق کیا، علوم میں دنیاوی علوم اور دینی علوم اور پھر علومِ محمودہ اور علومِ مذمومہ، فرض اور فرض کفایہ کی تقسیم کی، وقت کے فریضہ اور اصل کام کی طرف توجہ دلائی، اہلِ دولت اور اغنیا کی کوتاہیوں اور ان کی مخصوص برائیوں کو کھول کر بیان کیا، سلاطین و حکام پر جرأت کے ساتھ تنقید کی، اور ان کے جبر و ظلم، خلاف شرع اعمال و قوانین کی مذمت کی، اس کے علاوہ جمہور و عوام کے امراض اور مختلف طبقوں اور مقامات کے منکرات، مذموم عادات اور مخالف دین رسوم و بدعات کی تفصیل کی۔ اس طرح یہ کتاب اسلام میں پہلی مفصل و مدلل کتاب ہے جس میں پوری زندگی اور بگڑے ہوئے اسلامی معاشرے کا قوت کے ساتھ احتساب کیا گیا ہے اور اخلاقی بیماریوں کے عوارض و اسباب اور ان کا طریق علاج بتایا گیا ہے۔

علماء و اہل دین

امام غزالیؒ کے نزدیک اس عالمگیر فساد، دینی و اخلاقی انحطاط کی سب سے بڑی ذمہ داری علما پر ہے، جو ان کے نزدیک امت کا نمک ہیں، اگر نمک بگڑ جائے تو اس کو کون سی چیز درست کر سکتی ہے، بقول شاعر

یا معشر القراء یا ملح البلد

ما یصلح الملح اذا الملح فسد

اے جماعت علماء، اے وہ جو شہر کا نمک ہے۔ بھلا یہ بتلاؤ کہ جب نمک ہی بگڑ جائے تو پھر اس کی اصلاح کس سے کی جائے۔

ایک جگہ امراضِ قلب کی کثرت اور عام غفلت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الثالثة و هوالداء العضال فقد الطبيب فان الاطباء هم العلماء و قد مرضوافی هذه الاعصار مرضاً شديدا و عجزوا عن علاجه

تیسرا سبب اور وہ لاعلاج مرض کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ہے کہ مریض موجود ہیں اور طبیب مفقود، طبیب علماء ہیں اور وہ خود اس زمانہ میں بری طرح بیمار ہیں، اور علاج سے عاجز ہیں۔

ان کے نزدیک سلاطین وحکام کی خرابی کا سبب بھی علما کی کمزوری اور اپنے فرائض سے غفلت ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں

وبالجملة انما فسدت الرعية بفساد الملوك و فساد الملوك بفساد العلماء فلولا القضاة السُّوء والعلماء السوء لقل فساد الملوك خوفا من انكارهم

خلاصہ یہ ہے کہ رعیت کی خرابی کا سبب سلاطین کی خرابی ہے اور سلاطین کی خرابی کا سبب علماء کی خرابی ہے اس لیے کہ اگر خداناترس قاضی اور علماسونہ ہوتے تو سلاطین اس طرح نہ بگڑتے اور ان کو علماء کی روک ٹوک کا کھٹکا ہوتا۔

ان کو علماء وقت سے شکایت ہے کہ وہ علما سلف کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور کلمۂ حق عند سلطان جائر کا فریضہ انجام نہیں دیتے، ان کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ خود بہت سے علما دنیا طلبی اور جاہ طلبی کا شکار ہوگئے ہیں، وہ سلاطین وقت اور اربابِ حکومت کے سامنے علماء حق کی جرأت و بیباکی اور احتساب و انکار کے موثر واقعات نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] احیاء العلوم الدین ج ۲ ص ۱۳۲

> یہ تھا علماء کا طرزِ عمل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شان، ان کو سلاطین کی شان و شوکت کی ذرا پرواہ نہ تھی، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد رکھتے تھے اور ان کو اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر بھی راضی تھے کہ ان کو شہادت نصیب ہو، چونکہ ان کی نیت خالص تھی، اس لیے ان کے کلام سے پتھر موم ہو جاتے تھے، اور بڑے سے بڑے سنگ دل متاثر ہوتے تھے، اب تو حالت یہ ہے کہ طمع دنیا نے علماء کی زبانیں گنگ کر رکھی ہیں، وہ خاموش ہیں، اگر بولتے بھی ہیں تو ان کے اقوال و حالات میں مطابقت نہیں ہوتی، اس لیے کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر آج بھی وہ خلوص و صداقت سے کام لیں، اور علم کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں تو ان کو ضرور کامیابی ہو، کیونکہ رعیت کی خرابی سلاطین کی خرابی کا نتیجہ ہے، اور سلاطین کی خرابی علماء کی خرابی کا نتیجہ ہے اور علماء کی خرابی کی وجہ دولت اور جاہ کی محبت کا غلبہ ہے اور جس پر دنیا کی محبت غالب آجائے وہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر بھی احتساب اور روک ٹوک نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ سلاطین و اکابر۔[1]

امام غزالیؒ کے زمانہ میں ایک عالَم کا عالَم فقہ کی جزئیات اور اختلافی مسائل میں مشغول تھا، مباحثہ و مناظرہ کا بازار گھر گھر اور ملک کے چپہ چپہ پر گرم تھا، مجالس و تقریبات اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق بھی انہی مذہبی و فقہی مباحثوں اور مناظروں سے تھی، اس بارہ میں علماء و طلبہ کا انہماک اور غلو اتنا بڑھ گیا تھا کہ تمام دوسرے علوم و مشاغل اور خدمتِ دین کے شعبے نظر انداز ہوتے جا رہے تھے، حد یہ ہے کہ اصلاحِ نفس، تہذیب اخلاق اور سعادت اُخروی کا جس علم اور کوشش پر انحصار تھا، اس سے بھی توجہ ہٹ گئی تھی، امام غزالی اس صورت حال پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

1 احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۳۱۲

"اگر کسی فقیہ سے ان مضامین (صبر وشکر، خوف ورجا وغیرہ یا بغض و حسد وکینہ، ناشکری، دغا فریب وغیرہ) میں سے کسی کی بابت حتیٰ کہ اخلاص وتوکل اور ریا سے بچنے کے طریقوں کے متعلق سوال کیا جائے جس کا جاننا اس کے لیے فرض عین ہے، اور اس کی طرف سے غفلت کرنے میں آخرت کی تباہی کا خطرہ ہے تو وہ جواب نہ دے سکے گا، اور اگر آپ لعان وظہار سبق ورمی کو دریافت کریں تو وہ ایسی ایسی باریک جزئیات کے دفتر کے دفتر سنادے گا جس کی ضرورت مدتوں پیش نہیں آتی، اور اگر کبھی ضرورت پیش آجائے تو شہر میں ان کے متعلق فتویٰ دینے والا، اور بتانے والا ہر وقت موجود ہے، لیکن یہ عالم دن رات انہی جزئیات کے سلسلہ میں محنت کرتا رہے گا، اور ان کے حفظ و درس میں مشغول رہے گا اور اس چیز سے غفلت برتے گا، جو دینی حیثیت سے اس کے لیے ضروری ہے، اگر اس سے کبھی اس بارہ میں سوال ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں اس علم میں اس لیے مشغول ہوں کہ وہ علم دین ہے اور فرض کفایہ ہے اور وہ اس کے تعلیم و تعلم کے بارہ میں اپنے کو بھی مغالطہ دیتا ہے، اور دوسروں کو بھی۔ حالانکہ سمجھ دار آدمی خوب جانتا ہے کہ اگر اس کا مقصد فرضِ کفایہ کے حق کو ادا کرنا ہو، اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہوتا تو وہ اس فرضِ کفایہ پر فرضِ عین کو مقدم رکھتا بلکہ دوسرے فرض کفایہ بھی ہیں، جن کو مقدم ہونا چاہیے مثلاً کتنے شہر ہیں جن میں صرف غیر مسلم طبیب ہیں جن کی شہادت احکام فقہ میں قبول نہیں کی جاسکتی، لیکن ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی عالم (اس کمی اور ضرورت کو محسوس کرکے) علم طب کی طرف توجہ کرتا ہو، اس کے بالمقابل علم فقہ بالخصوص خلافیات و جدلیات پر طلبہ ٹوٹ پڑتے ہیں، حالانکہ شہر ایسے علماء سے بھرا ہوا

ہے جن کا مشغلہ فتویٰ نویسی اور مسئلہ بتلانا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ علماء دین ایسے فرض کفایہ میں مشغول ہونے کو کیسے درست سمجھتے ہیں جس کو ایک جماعت کی جماعت سنبھالے ہوئے ہے اور ایسے فرض کو انھوں نے کیسے چھوڑ رکھا ہے، جس کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہیں، کیا اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ ہے کہ طب کے ذریعہ سے اوقاف کی تولیت، وصیتوں کی تنفیذ اور یتیموں کے مال کی نگرانی و انتظام اور منصب قضا و افتا پر تقرر اور ہمعصروں اور ہم چشموں میں فوقیت و امتیاز اور دشمنوں اور حریفوں پر حکومت و غلبہ حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں"۔[1]

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

کوئی شہر بھی ایسا نہیں ہے جہاں کچھ ایسے کام نہ ہوں جو فرض کفایا کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہیں، زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ایک طب ہی کو لیجیے کہ اکثر اسلامی شہروں میں مسلمان طبیب موجود نہیں، جن کی شہادت شرعی امور میں معتبر ہو، علماء اس مشغلہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، اس طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض کفایہ ہے۔ (لیکن متروک ہو رہا ہے)[2]۔

وہ ایک جگہ عام جہالت و غفلت، دین سے ناواقفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور تبلیغ اور عمومی تعلیم کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

اس شخص کے لیے جس کو اپنے دین کی واقعی فکر ہے، یہ (تبلیغ و تعلیم) خود ایسا مشغلہ ہے کہ پھر اس نادر الوقوع جزئیات، دوراز کار تفصیلات

---

1 احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۱۹

2 ایضاً ص ۳۸

اور ان علوم میں موشگافی کرنے کی فرصت ہی نہیں ہو سکتی جو خود فرض کفایہ ہیں۔[1]

امام غزالیؒ محققانہ و مورخانہ حیثیت سے اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ اختلافی مسائل نے پچھلے دور میں کیوں اس قدر اہمیت اور مقبولیت حاصل کر لی، اور علما نے اس کو اپنی ذہانتوں اور محنتوں کا میدان بنالیا، اور ان کی بہترین توجہات اس میں صرف ہونے لگیں؟ امام غزالی کے نزدیک اس کے کچھ تاریخی اسباب ہیں اور ان کے نتیجہ میں ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے جانشین حضرات خلفائے راشدین خود بڑے عالم، فقیہ اور صاحبِ فتویٰ تھے، ان کو شاذ و نادر کسی خاص موقع پر دوسرے اہلِ علم صحابہؓ سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی تھی، اس لیے علما صحابہ علوم آخرت کے لیے فارغ اور ان میں منہمک تھے، اگر کوئی فتویٰ کا موقع پیش آتا تو وہ ایک دوسرے پر محمول کرتے اور ہمہ تن متوجہ الی اللہ رہتے جیسا کہ ان کے حالات میں منقول ہے، جب ان لوگوں کی نوبت آئی جو خلافت کا استحقاق اور قابلیت نہیں رکھتے تھے، اور ان میں خود فیصلہ کرنے اور فتویٰ دینے کی صلاحیت نہیں تھی تو ان کو مجبوراً دوسرے علماء سے مدد لینی پڑی اور ان کو ساتھ رکھنا پڑا تا کہ ان سے وہ فتویٰ حاصل کرتے رہیں علماء تابعین میں ابھی ایسے لوگ زندہ تھے جو قدیم روش پر تھے، اور جن میں دین کی حقیقت اور سلف کی شان تھی، جب ان کو بلایا جاتا تو وہ گریز کرتے، اور اعراض کرتے، خلفاء (بنی امیہ و بنی عباس) کو انہیں تلاش کرنا پڑتا اور عہدہ قضا اور حکومت کے لیے ان سے اصرار کرنے کی کوشش پیش آتی، ان کے زمانہ کے لوگوں نے جب علماء کی

---

1 احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۳۷۔۳۸

یہ شان، سلاطین و حکام کا ایسا رجوع اور اہلِ علم کا یہ استغنا اور بے پرواہی دیکھی تو وہ سمجھے کہ حصولِ جاہ و عزت کے لیے فقہ کا علم بہترین نسخہ ہے، اسی سے حکام کا تقرب اور قضاء و افتاء کا منصب حاصل ہوتا ہے، بس وہ اسی طرف متوجہ ہو گئے، انھوں نے حکام کے سامنے خود اپنی پیشکش کی اور ان سے مراسم پیدا کیے اور عہدوں اور انعامات کے خود امیدوار بنے، بعض کو تو کچھ ہاتھ نہ آیا، بعض کامیاب ہوئے، جو کامیاب بھی ہوئے وہ امیدواری کی ذلت سے محفوظ نہیں رہے، اور ان کو اپنے مقام سے نیچے اترنا، اور عامیانہ اور مبتذل سطح پر آنا پڑا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء جو پہلے مطلوب تھے، اب طالب بن گئے، پہلے حکام سے استغنا اور اعراض کی وجہ سے معزز تھے، اب ان کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو گئے، البتہ اس کلیہ سے ہر دور میں کچھ اللہ کے بندے مستثنیٰ رہے ہیں۔

ان زمانوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور توجہ احکام اور فتاویٰ کی طرف تھی، اور انتظامات اور مقدمات کے سلسلہ میں ان کی ضرورت بھی زیادہ تھی، اس کے بعد بعض رؤسا و حکام کو اصول و قاعدے سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کا شوق ہوا کہ ہر فریق کے دلائل و مباحث سنیں اور ان کا بحث و مباحثہ دیکھیں، لوگوں کو ان رؤسا و حکام کے اس ذوق کا علم ہوا تو وہ علم کلام کی طرف رجوع ہوئے، مصنفین نے اس موضوع پر بہ کثرت تصنیفات کیں اور مناظرے کے اصول و قواعد کو مرتب کیا، اور رد و قدح کو ایک فن بنا دیا۔ ان لوگوں کا یہ بیان تھا کہ ان کا مقصود دین کی طرف سے مدافعت و جواب دہی، سنت کی نصرت، اور بدعت کی تردید و مخالفت ہے، ٹھیک جیسے ان لوگوں کے پہلے کے لوگ یہ کہتے تھے کہ فتاویٰ میں مشغولیت سے مقصود محض

دین، خدمتِ خلق اور بندگان خدا پر شفقت اور خیر خواہی ہے، اس کے بعد کچھ رؤسا و حکام ایسے ہوئے جو علم کلام و مناظرہ کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس سے تعصب، جنگ و جدال اور بعض اوقات خونریزی و فساد کی نوبت آجاتی ہے، ان کو فقہی بحث و مناظرہ سے رغبت تھی، اور اس تحقیق کا شوق تھا کہ خصوصیت کے ساتھ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ میں سے کس کا مذہب زیادہ صحیح ہے، لوگوں نے یہ دیکھ کر کلام و عقائد کو بالائے طاق رکھ دیا اور اختلافی مسائل بالخصوص امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اختلافات کو موضوع سخن بنالیا، اور امام مالکؒ امام سفیان ثوریؒ، اور امام احمدؒ وغیرہ کے مذاہب و اختلافات کو نظر انداز کر دیا (اس لیے ان کے اختلافات سے حکام کو دلچسپی نہ تھی) ان کا کہنا تھا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کی باریکیوں کو ظاہر کریں، مذاہب کے وجوہ و اسباب کو بیان کریں، اور فتاویٰ کے اصول کو مرتب و مدون کریں انھوں نے اس میں کثرت سے تصنیفات کیں اور استنباطات کیے اور مجادلہ اور تصنیف کے فن کو ترقی دی اور یہ مشغلہ ابھی تک جاری ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کیا دکھائے گا اور اس میں کیا تغیر ہو گا تو دراصل اختلافی مسائل اور مناظرہ سے علماء کی دلچسپی اور ان کے انہماک کا سبب یہ ہے کہ جو ہم نے بیان کیا۔ اگر اہلِ دنیا اور ارباب اقتدار کو (امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے علاوہ) کسی اور امام یا (اختلافی مسائل و مناظرہ کے علاوہ) کسی اور علم سے دلچسپی ہو جائے تو علماء بھی اسی کی طرف جھک پڑیں گے اور اس کی وجہ یہی بیان کریں گے کہ ان کا مقصد علم دین اور قربتِ خداوندی کے سوا کچھ نہیں

ہے۔[1]

اس کے بعد امام غزالی نے تفصیل کے ساتھ مناظرہ اور بحث و مجادلہ کے اخلاقی و روحانی نقصانات و مفاسد اور اس کے شرور و آفات بیان کیے وہ عرصہ تک اس میدان کے شہسوار رہ چکے تھے، اس لیے اس سلسلہ میں ان کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے اور مشاہدات اور ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔[2]

اس سلسلہ میں ایک بڑا مغالطہ الفاظ کا تھا، امام غزالی کے زمانہ کے علوم مروجہ اور ان کی بگڑی ہوئی شکلوں کے لیے جو الفاظ عنوان کا کام دیتے تھے، وہ قدیم الفاظ تھے، جو قرآن و حدیث، صحابہؓ کے کلام اور علماء سلف کی سیرتوں میں بہ کثرت آتے ہیں، مثلاً اختلافی مسائل فقہ کی نادر الوقوع جزئیات اور باریکیوں کے لیے بے تکلف "فقہ" کا لفظ استعمال ہوتا تھا، ہر طرح کے علمی اشغال اور شرعی و غیر شرعی علم کے لیے مطلق "علم" کا لفظ بولا جاتا تھا، علم کلام اور اس کے فلسفیانہ مباحث کو "توحید" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بے سروپا روایات و سطحیات اور عبارات آرائی و رنگین بیانی کو "تذکیر" کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا ہر طرح کے نامانوس مضامین اور پیچیدہ عبارتوں کو "حکمت" کا خطاب دیا جاتا تھا، اور پھر ان سب خود ساختہ اعمال و اشغال پر وہ سب فضائل چسپاں کیے جاتے تھے، جو قرآن و حدیث میں ان علوم کی حقیقتوں کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں، مثلاً فقہ کی اس بگڑی ہوئی شکل (محض اختلافات و جزئیات کے لیے) قرآن مجید کی آیت لِیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ اور حدیث مَنْ یُّرِدِ اللہ بِہٖ خیراً یفقه فی الدین، فلسفہ اور پانچویں صدی کے علم کلام کے لیے وَمَنْ یوت الحکمه فقد اوتی خیرا کثیرا کی بشارت[3]، جاہل اور ناخدا ترس واعظوں کے

---

1. احیا علوم الدین ج ۱ ص ۳۸
2. ملاحظہ ہو احیاء ج ۱ ص ۴۳، ۴۰
3. چنانچہ فلسفہ کی درسی کتابوں پر حتیٰ کہ طب کی بعض بعض کتابوں کے سرورق پر اب بھی یہ آیت نظر آتی ہے۔

عامیانہ مواعظ کے لیے فذکر انما انت مذکر اور دوسری آیات و احادیث منطبق کی جاتی تھیں، امام غزالی نے اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا، اور تفصیل سے بتلایا کہ یہ الفاظ اپنی اصل حقیقت کھو چکے ہیں اور اپنے اصل مفہوم سے دور ہوتے ہوتے کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں ان کا جو مفہوم تھا، اس سے علماء کے ان موجودہ مشاغل کو کوئی مناسبت نہیں، ان کی یہ بحث الفاظ کے سفر کی ایک دلچسپ روداد اور اصطلاحات اور عنوانات کے تغیر کی ایک سبق آموز تاریخ ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ ہے، جو علمی اور دینی حلقوں میں اس وقت پھیلی ہوئی تھیں۔[1]

حکام و سلاطین

دوسرا جو امام غزالیؒ کے نزدیک اس عالمگیر فساد، اخلاقی انحطاط اور دینی تنزل کا ذمہ دار تھا، وہ اہلِ حکومت اور سلاطین و امراء کا طبقہ تھا، امام غزالی سے دو سو برس پہلے حضرت عبد اللہ ابن مبارک نے انہی دونوں (علماء و سلاطین) کے گروہوں کو دین کا بگاڑنے والا قرار دیا تھا۔

وھل افسد الدین الا الملوک
واحبار سوء ورھبانھا

امام غزالیؒ نے ایک ایسے زمانہ میں کہ بادشاہ مطلق العنان اور ہر طرح کے قوانین وضوابط سے بالاتر تھے، اور ان پر اعتراض کرنا موت کو پیغام دینا تھا، اس طبقہ کا پوری جرأت کے ساتھ احتساب کیا اور ان پر آزادانہ تنقید کی۔ ان کے زمانہ میں بادشاہوں کے عطیوں اور پیشکشوں کو قبول کرنے کا عام رواج تھا، امام غزالیؒ نے اموال سلطانی کو ناجائز اور بالعموم مشتبہ اور حرام بتلایا۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

اغلب اموال السلاطین حرام فی ھذہ الاعصار، والحلال

1 ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین۔ بیان ما یدل من الفاظ العلوم۔ ج ۱، ص ۲۸۔ ۳۴

فی ایدیھم معدوم او عزیز
بادشاہوں کے مال اس زمانہ میں عموماً حرمت سے خالی نہیں، حلال مال ان کے پاس یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔
دوسری جگہ لکھتے ہیں:

ان اموال السلاطین فی عصرنا حرام کلھا او اکثرھا و کیف لا والحلال ھوالصدقات والفیٔ و الغنیمۃ ولا وجودلھا ولیس یدخل منھا فی یدالسلطان و لم یبق الا الجزیۃ وانھا توخذ بانواع من الظلم لا یحل اخذھا بہ فانھم یجاوزون حدودالشرع فی الماخوذ والماخوذمنہ والوفاء لہ بالشرط ثم اذا نسب ذالك الی ما ینصب الیھم من الخراج المضروب علی المسلمین و من المصادرات والرشاد صنوف الظلم لم یبلغ عشر معشار عشیرہ

سلاطین کے مال ہمارے زمانہ میں یا تو سب حرام ہیں، یا ان میں کا بڑا حصہ اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اس لیے کہ حلال مدیں زکوۃ، فے اور مال غنیمت کی ہیں اور ان کا کہیں وجود نہیں اور ان میں سے کوئی چیز بادشاہ تک پہنچنے نہیں پاتی، لے دے کے صرف جزیہ کی مد ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ وہ مختلف ظالمانہ طریقوں سے وصول کیا جاتا ہے جن سے اس کا وصول کرنا جائز ہی نہیں، عمال سلطنت حدود شریعت سے تجاوز کرتے ہیں اور ملں کی مقدار میں شریعت کا کچھ پاس نہیں کیا جاتا ہے، نہ اس کے شرائط پورے کیے جاتے ہیں پھر مسلمانوں پر مقرر شدہ خراج مالوں اور جائیدادوں کی ضبطی رشوت اور انواع و اقسام کے ظلم سے ان پر سونے چاندی کی جو بارش ہوتی ہے' اس سے

1 احیاء علوم الدین ج ۲، ۱۲۰
2 ایضاً ص ۱۲۲

تو اس جزیہ کو بھی کوئی نسبت نہیں۔

امام غزالیؒ اس سے ترقی کر کے یہاں تک لکھتے ہیں کہ سلاطین وقت سے ان رقوم کا قبول کرنا بھی مناسب نہیں جن کے متعلق تحقیق یا گمان غالب ہے کہ وہ مشتبہ اور ناجائز نہیں ہیں' اس لیے کہ اس میں بہ کثرت دینی مفاسد ہیں' اس موقع پر گزشتہ عہد کی مثالیں دی جا سکتی تھیں کہ سلف میں بعض علما و صلحاء نے اپنے زمانہ کے خلفاء و سلاطین کی پیشکش بعض اوقات قبول کی ہیں، امام غزالیؒ اس عہد کے ملوک و سلاطین اور ان دونوں زمانوں کے حالات کا فرق بیان کرتے ہیں:

> دور اوّل کے ظالم سلاطین خلفاء راشدین کے عہد کے قرب کی وجہ سے اپنے ظالمانہ رویہ کا احساس رکھتے تھے، اور ان کو صحابہ و تابعین کی دلجوئی اور استمالت کا خیال رہا کرتا تھا اور اس بات کی فکر رکھتے تھے کہ وہ کسی طرح ان کے عطیے اور انعامات قبول کر لیں۔ وہ ان کے پاس یہ رقمیں اور نذرانے بغیر ان کی طلب کے اور ان کی شان اور مرتبہ پر حرف آئے بغیر ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے بلکہ ان کے قبول کر لینے پر ان کے احسان مند ہوتے تھے، اور مسرت کا اظہار کرتے تھے، وہ حضرات بھی ان چیزوں کو لے کر تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ وہ سلاطین کی اغراض میں ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ نہ ان سے ملاقات کرنے آتے تھے، نہ ان کے ساتھ اجتماع کو پسند کرتے تھے، نہ ان کو ان کی درازی عمر اور جاہ و اقبال کے باقی رہنے کی خواہش تھی، بلکہ وہ ایسے ظالموں کے لیے بددعا کرتے تھے، ان کے بارہ میں آزادانہ اظہار خیال کرتے تھے، اور ان کے منہ پر ان کے خلافِ شرع امور پر ٹوک دیا کرتے تھے اور تردید کرتے تھے۔ اس لیے اس کا خطرہ نہ تھا کہ جتنا ان کو سلاطین سے فائدہ پہونچا ہے، اتنا ہی ان کو سلاطین کے اس تعلق سے دینی نقصان پہنچے گا، اس لیے ان کے قبول

کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی لیکن اس کے برعکس آج سلاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ یہ فیاضی کرتے ہیں، جن کے متعلق ان کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ ان سے کام لے سکیں گے، ان سے ان کو سہارا حاصل ہو گا، وہ ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں گے، ان سے ان کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی، اور وہ ہمیشہ دعاگوئی، ثناخوانی اور حاضر و غائب ان کی تعریف و توصیف میں لگے رہیں گے۔ اس سلسلہ میں پہلا درجہ سوال کی ذلت کا ہے، دوسرا خدمت کے لیے آمد ورفت کا، تیسرا تعریف و دعاگوئی، کا چوتھا یہ کہ ضرورت کے وقت ان کے اغراض میں ان کی مدد کی جائے، پانچواں حاضر باشی اور دربار داری، جلوس کی شرکت، چھٹا اظہار محبت، دوستی، اور حریفوں کے مقابلہ میں ان کی امداد و نصرت، ساتواں ان کے ظلم اور ان کے عیوب اور بداعمالیوں کی پردہ پوشی، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی درجہ کے لیے تیار نہیں ہے، تو خواہ وہ امام شافعیؒ کے مرتبہ کا ہو یہ سلاطین ایک پیسہ بھی اس پر خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے اس لیے اس زمانہ میں ان بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں، جس کے متعلق یہ علم ہے کہ وہ حلال ہے، اس لیے کہ اس کے وہ نتائج ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس مال کا تو کیا ذکر جس کے متعلق معلوم ہے کہ حرام یا مشتبہ ہے، اب اگر کوئی شخص ان سلاطین کے اموال کو جرأت کے ساتھ قبول کرتا ہے اور صحابہ و تابعین کی مثال دیتا ہے، تو وہ درحقیقت فرشتوں کو لوہاروں پر قیاس کرتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے اموال کو قبول کرنے کے بعد ان سے ملنے جلنے اور اختلاط کی ضرورت پیش آئے گی، ان کا لحاظ کرنا پڑے گا، ان کے اہلکاروں اور عمال کی خدمت کرنا پڑے گی اور ان سے دبنا اور ان کے

سامنے جھکنا پڑے گا، پھر ان کی تعریف اور ان کے در پر حاضری دینے سے چارہ نہیں، اور یہ سب معصیت کی باتیں ہیں۔

جب گذشتہ بیان سے سلاطین کی آمدنی کے ابواب اور اس میں سے حلال و حرام کی ـــــ تفصیل معلوم ہو گئی تو اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ انسان شاہی رقوم میں سے اتنا جزو قبول کرے جو حلال ہے، اور وہ اس کا مستحق ہے اور وہ رقم اس کے پاس گھر بیٹھے آتی ہو اور کسی حاکم یا ملازم کی تلاش و خدمت اور ان سلاطین و حکام کی تعریف و تصدیق کی ضرورت بھی نہ ہو اور نہ ان کی امداد و اعانت کی شرط ہو تو پھر (مسئلہ کے اعتبار سے) ایسی رقم کا قبول کرنا حرام نہیں ہے، لیکن دوسری خرابیوں اور بعد کے نتائج کے لحاظ سے مکروہ ضرور ہے۔[1]

ایک دوسری جگہ سلاطین سے کنارہ کشی اور ان کے افعال و مظالم سے نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں

الحالة الثانية ان يعتزل عنهم فلا يراهم ولا يرونه و هوا لواجب والسلامة فيه فعليه ان يعتقد بغضهم على ظلمهم ولا يحب بقائهم ولا يثنى عليهم فلا يستخبر عن احوالهم ولا يتقرب الى مصلين بهم-

دوسری حالت یہ ہے کہ انسان ان سلاطین سے الگ تھلگ رہے کہ ان کا سامنا ہی نہ ہونے پائے اور یہ واجب ہے اور اسی میں حفاظت ہے۔ انسان کو ان کے مظالم کی بنا پر ان سے بغض کا اعتقاد رکھنا چاہیے۔ وہ نہ ان کی زندگی کا خواہش مند ہو نہ ان کی تعریف کرے، نہ ان کے حالات کی جستجو رکھے، نہ ان کے مقربین سے میل جول۔

شخصی سلطنت اور جابر و مستبد بادشاہوں اور خود مختار وزراء و حکام کے اس دور میں جب پوری

---

1 احیا علوم الدین ج ۲، ۱۲۳

کی پوری قوم اور اس کے بیش قیمت سے بیش قیمت افراد کی زندگی ان کے رحم و کرم پر تھی، اور جب شبہہ پر قتل عام ہو سکتا تھا، امام غزالی کی یہ صاف گوئی اور سلطنت کے نظام مالیات، آمد و صرف پر یہ کھلی ہوئی تنقید اور علماء کو سلاطین و حکام کے عطیوں کو قبول نہ کرنے کی ترغیب و تبلیغ (جو حکومت سے عدم تعاون اور اظہار ناراضگی یا بے تعلقی کی علامت سمجھی جاتی تھی) ایک اچھا خاصا جہاد تھا، جس کی نزاکت کا اندازہ اخبارات اور تقریروں کی آزادی کے اس عہد اور جمہوری اور دستوری (خواہ برائے نام) دور میں صحیح طور پر نہیں لگایا جاسکتا۔

امام غزالیؒ نے صرف تحریر و تصنیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ جب ان کو بادشاہ وقت سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں بھی انہوں نے کلمۂ حق بلند کیا۔ ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر پورے خراسان کا فرمانروا تھا، امام غزالیؒ نے ملاقات کے وقت اس سے خطاب کر کے کہا کہ:

> افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں، اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوقہائے زریں کے بار سے[1]۔

محمد بن ملک شاہ کو جو سنجر کا بڑا بھائی اور اپنے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا، جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوفِ خدا اور اصلاحِ ملکی کی طرف متوجہ کیا[2]۔

مشرقی سلطنتوں میں عموماً حکومت کا تمام نظم و نسق چونکہ وزراء کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور وہی در و بست حکومت کے منتظم اور ذمہ دار ہوتے تھے، اس لیے انہی کی اصلاح و توجہ سے مملکت کی اصلاح ہو سکتی تھی۔ امام غزالی اس حقیقت سے واقف تھے، اس لیے انھوں نے سلاطین سلجوقیہ سے زیادہ ان کے وزرا کی طرف توجہ کی، ان کو مفصل خطوط اور ہدایت

---

1. مکتوبات امام غزالیؒ ۱۹

2. یہ ہدایت نامہ ایک رسالہ کی شکل میں ہے، اور "نصیحت الملوک" کے نام سے موسوم ہے چونکہ محمد شاہ کی زبان فارسی تھی، اس لیے یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے۔

نامے لکھے اور بڑی جرأت و صفائی کے ساتھ حکومت کی بدنظمیوں حقوق کی پامالی، حکام کی مردم آزاری، اہل کاران دولت کی دولت ستانی، ذمہ داروں کی غفلت کی طرف توجہ دلا کر اور پچھلے وزراء اور صدورِ حکومت کا انجام یاد دلا کر اصلاح و تنظیم کی طرف متوجہ کیا، ان کے یہ خطوط شخصی جرأت اظہارِ حق اور تاثیر و قوت انشاو تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

فخر الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

بداں کہ ایں شہر از قحط و ظلم ویران بود و تاخیر تو از اسفرائن و دامغان بود ہمہ می ترسیدند و دہقاناں از بیم غلہ می فروختند و ظالماں از مظلوماں عذر می خواستند اکنوں کہ اینجا رسیدی ہمہ ہراس و خوف برخاست و دہقاناں و خبازاں تبد بر غلہ، دوکان نہادند، و ظالماں دلیر گشتند، اگر کسی کار ایں شہر بخلاف ایں شکایت می کند دشمن دین تست، بداں کہ دعائے مردمانِ طوس بہ نیکی و بدی مجرب است و عمید را ایں نصیحت بسیار کردم نپذیرفت تا حال وے عبرت ہمہ گشت بشو ایں سخنہائے تلخ با منفعت از کسی کہ او طمع گاہ خویش را بہمہ سلاطین وداع کردہ است تا ایں سخن می تواند گفت و قدر ایں بشناس کہ نہ ہمانا از کسے دیگر شنوی بدانکہ ہر کس کہ خبر ایں می گوید با تو طمع وے حجاب است میان او و کلمہ حق"۔

مجیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اما فریاد رسیدن خلق بر عموم واجب است کہ کار ظلم از حد گذشتہ و بعد ازاں کہ من شاہد ایں حال می بودم قریب یک سال است کہ از طوس ہجرت کردہ ام تا باشد کہ از مشاہدۂ ظالماں بے رحمت و بے حرمت خلاص یابم چوں بحکم ضروری معاودت افتاد ظلم ہمچناں متواتر است"۔

پھر وزراء سابقین کا انجام لکھ کر مجیر الدین کو متنبہ کرتے ہیں۔

و بحقیقت شناسد کہ ہیچ وزیر بدیں بلا مبتلا نبود کہ وے در روزگار ہیچ
وزیر آں ظلم و خرابی نہ رفت کہ اکنوں می رود، واگرچہ وے کارہ است
و لیکن در خبر چنیں است کہ چوں ظالماں را روز قیامت مواخذہ کنند
ہم متعلقاں راو ہم ایشاں رابداں ظلم بگیرند، مسلماناں راکادبا ستخواں
رسید و متاصل گشتند دہر دینارے کہ قسمت کردند اضعاف آں از
رعیت بشد و بسلطان فرسید و در میانہ ارذال عواماں و ظالماں ببردند۔

مسلمانوں کے دوسرے طبقے

طبقۂ علماء و طبقہ سلاطین و حکام کے علاوہ انھوں نے عام زندگی کا بھی جائزہ لیا ہے، اس میں جس قدر غیر دینی عناصر، بدعات و منکرات، مغالطے اور خود فریبیاں داخل ہو گئی ہیں، ان کی تنقید کی ہے، احیاء العلوم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال اور عالمانہ زندگی کے باوجود وہ اس وقت کی سوسائٹی اور عام زندگی سے واقف ہیں، اور ان کا زندگی کا مطالعہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے، انھوں نے مسلمانوں کی عمومی زندگی اور امت کے مختلف طبقات اور ان کی مختلف بیماریوں اور کمزوریوں کی جو نشاندہی کی ہے، اس سے ان کی قوت مشاہدہ اور قوتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے ایک مستقل باب ان منکرات کی تفصیل میں لکھا ہے جو عادات میں داخل ہو چکے ہیں اور لوگوں کو ان کا منکر (خلافِ شرع و اخلاق) ہونا محسوس نہیں ہوتا، اس سلسلہ میں انھوں نے پوری شہری زندگی پر نظر ڈالی ہے، اور اس کے نمایاں منکرات کا تذکرہ کیا ہے اور مساجد سے لے کر بازاروں سڑکوں، حمام اور دعوت کی محفلوں تک کے منکرات کو شمار کر دیا ہے[1]۔

انھوں نے "احیاء العلوم" کا ایک مستقل حصہ (کتاب ذم الغرور) ان لوگوں کے متعلق لکھا ہے جو مختلف قسم کے مغالطوں اور فریب نفس میں مبتلا ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے ہر طبقہ کے فریب خوردہ اشخاص اور ان کی غلط فہمیوں اور خود فریبیوں کا حال بیان کیا ہے،

---

1 ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین ج ۲ از صفحہ ۲۹۳ تا ۲۹۹

اور ان کے بعض ایسے نفسیاتی امراض اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے، جن کو صرف ایک دقیق النظر مصلح اور ایک تجربہ کار ماہر نفسیات ہی دیکھ سکتا ہے، اس باب میں انھوں نے علماء عباد و زہاد، اور امراء و اغنیا اور اہلِ تصوف سب کا جائزہ لیا ہے، اور سب کے خصوصی امراض اور بے اعتدالیوں کا پردہ فاش کیا ہے، اور ہر ایک کے متعلق بڑے پتہ کی باتیں لکھی ہیں جس سے ان کی ذہانت دقیقہ رسی اور حقیقت شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے زمانہ کے علماء نے جن جن علوم کے اشتغال میں حد سے تجاوز کر رکھا تھا، مثلاً فقہی جزئیات و خلافیات، علم کلام و مباحثہ و مجادلہ، وعظ و تذکیر، علم حدیث اور اس کے متعلقات نحو، لغت، شعر و مفردات کی تحقیق و حفظ میں غلو و مبالغہ اور زاہدوں کے ملفوظات و حالات کے یاد رکھنے پر اکتفا، اس سب پر انھوں نے تنقید کی، اور ان کو اپنے ان مضامین کے بارہ میں جو غلط فہمی اور خوش گمانی تھی، اس کی تحقیق کی اور حقیقتِ حال بیان کی اور آخر میں اپنا یہ تجربہ بیان کیا جو بالکل قرین قیاس ہے کہ "دنیاوی علوم مثلاً طب و حساب اور صنعتوں کے علم میں اس قدر خوش گمانی اور خود فریبی نہیں ہے جتنی علوم شرعیہ کے کہ وہ اپنے نتائج و مقاصد سے قطع نظر کر کے بجائے خود بھی ذریعہ مغفرت و تقرب سمجھے جاتے ہیں"[1]۔ اپنے زمانے کے عباد و زہاد اور اہلِ تصوف کو بھی انھوں نے بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے اور ان کی بڑی باریک باریک کوتاہیوں، خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کو محسوس کیا ہے، ان کے بہت سے ظاہری اعمال و رسوم کی تہہ میں ان کو نفس پرستی، جاہ طلبی، ریاکاری، ظاہری نقالی اور بے روح رسمیت نظر آئی ہے اور انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ اس کو ظاہر کر دیا[2]۔

اہل دولت اور اغنیا پر بھی انھوں نے بڑی صحیح گرفت کی ہے اور اس سلسلہ میں ان کے قلم سے حقائق نکل گئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں:

ان دولت مندوں میں بہت سے لوگوں کو حج پر روپیہ صرف کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے، وہ بار بار حج کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے

---

1 ایضاً ج ۳ ص ۳۳۳

2 ملاحظہ ہو احیا علوم الدین ج۳۔ از ۳۴۵ تا ۳۵۰

پڑوسیوں کو بھوکا چھوڑ دیتے ہیں، اور حج کرنے چلے جاتے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحیح فرمایا ہے کہ اخیر زمانہ میں بلا ضرورت حج کرنے والوں کی کثرت ہو گی، سفر ان کو بہت آسان معلوم ہو گا، روپیہ کی ان کے پاس کمی نہ ہو گی، وہ حج سے محروم و تہی دست واپس آئیں گے، وہ خود ریتوں اور چٹیل میدانوں کے درمیان سفر کرتے ہوں گے، اور ان کا ہمسایہ ان کے پہلو میں گرفتار بلا ہو گا۔ اس کے ساتھ کوئی سلوک اور غمخواری نہیں کریں گے۔

ابو نصر تمار کہتے ہیں کہ ایک شخص بشر بن الحارث کے پاس آئے اور کہا کہ میرا قصد حج کا ہے، آپ کا کچھ کام ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ تم نے خرچ کے لیے کیا رکھا ہے؟ اس نے کہا دو ہزار درہم، بشر نے کہا کہ تمہارا حج سے مقصد کیا ہے، اظہار زہد، شوقِ کعبہ یا طلب رضا اس نے کہا طلب رضا انھوں نے فرمایا کہ اچھا اگر میں تمھیں ایسی تدبیر بتلا دوں کہ تم گھر بیٹھے اللہ کی رضا حاصل کر لو، اور تم یہ دو ہزار درہم، خرچ کر دو اور تم کو یقین ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو گئی تو کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟ اس نے کہا بخوشی، فرمایا کہ اچھا پھر جاؤ، اس مال کو ایسے دس آدمیوں کو دے آؤ جو مقروض ہیں وہ اس سے اپنا قرض ادا کر دیں، فقیر اپنی حالت درست کرے، صاحبِ عیال اپنے بچوں کا سامان کرے، یتیم کا منتظم یتیم کو کچھ دے کر اس کا دل خوش کرے اور اگر تمہاری طبیعت گوارا کرے تو ایک ہی کو پورا مال دے آؤ اس لیے کہ مسلمان کے دل کو خوش کرنا، بیکس کی امداد کسی کی مصیبت دور کرنا، کمزور کی اعانت سو نفلی حجوں سے افضل ہے، جاؤ جیسا میں نے تم سے کہا ہے ویسا ہی کر کے آؤ ورنہ اپنے دل کی بات ہم سے کہہ دو، اس نے کہا کہ شیخ سچی بات یہ ہے کہ سفر کا رجحان غالب ہے، بشر سن کر

مسکرائے اور فرمایا کہ مال جب گندہ اور مشتبہ ہوتا ہے تو نفس تقاضا کرتا ہے کہ اس سے اس کی خواہش پوری کی جائے اور وہ اس وقت اعمال صالحہ کو سامنے لاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عہد فرمایا ہے کہ صرف متقین کے عمل کو قبول فرمائے گا[1]۔

دولت مندوں کا ایک گروہ بربنائے بخل دولت کی حفاظت میں مشغول رہتا ہے، اور ایسی بدنی عبادات سے اس کو دلچسپی ہوتی ہے جس میں کچھ خرچ نہیں، مثلاً دن کا روزہ، رات کی عبادت اور ختم قرآن وہ بھی فریب میں مبتلا ہیں، اس لیے کہ مہلک بخل ان کے باطن پر مستولی ہے، اور اس کے ازالہ کے لیے مال کے خرچ کرنے کی ضرورت ہے لیکن وہ ایسے اعمال میں مشغول ہیں، جس کی ان کو کوئی خاص ضرورت نہیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کے کپڑے کے اندر سانپ گھس گیا ہے، اور اس کا کام تمام ہونے والا ہے، اور وہ سکنجبین کے تیار کرنے میں مشغول ہے تاکہ صفرا کو تسکین ہو، حالانکہ جو سانپ کا مارا ہے، اس کو سکنجبین کی ضرورت کب پڑے گی؟ بشر سے کسی نے کہا کہ فلاں دولت مند کثرت سے روزہ رکھتا ہے اور نمازیں پڑھتا ہے، انھوں نے فرمایا کہ بیچارہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں مشغول ہے، اور فقیر کو محروم رکھتا ہے[2]۔

عوام کے امراض اور خود فریبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عوام دولت مندوں اور فقراء میں سے کچھ لوگ ہیں جن کو مجالس وعظ کی شرکت سے دھوکا لگا ہے، ان کا اعتقاد ہے کہ محض ان مجالس میں شرکت کافی ہے، انھوں نے اس کو ایک معمول بنالیا ہے، وہ سمجھتے

---

1 احیاء علوم الدین ج ۳، ۳۵۱، ۳۵

2 ایضاً ج ۳ ص ۳۵۲

ہیں کہ عمل اور نصیحت پذیری کے بغیر بھی مجلس وعظ میں شرکت باعث اجر ہے، وہ بڑے دھوکہ میں مبتلا ہیں، اس لیے کہ مجلس وعظ کی فضیلت محض اس لیے ہے کہ اس سے خیر کی ترغیب ہوتی ہے، اگر اس سے خیر کی آمادگی اور اس کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا تو اس میں کچھ خیر نہیں، رغبت بھی اس لیے محمود ہے کہ وہ عمل کی محرک ہے، اگر اس میں عمل پر آمادہ کرنے کی قوت نہیں تو اس میں بھی کوئی خیر نہیں، جو چیز کسی مقصد کا ذریعہ ہوتی ہے اس کی قیمت محض مقصد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہے، اگر وہ مقصد اس سے پورا نہ ہو تو وہ بے قیمت ہے، کبھی واعظ سے مجلس وعظ اور گریہ وبکا کی فضیلتیں سن سن کر اس کا دھوکا ہوتا ہے، کبھی کبھی اس پر عورتوں کی طرح ایسی رقت طاری ہوتی ہے، اور وہ رونے لگتا ہے، لیکن عزم کا کہیں پتہ نہیں ہوتا، کبھی کبھی کوئی ڈرانے والی بات سنتا ہے اور وہ تالیاں پیٹتا ہے، اور کہتا ہے، الٰہی توبہ! خدایا تیری پناہ اور وہ سمجھتا ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا، حالانکہ وہ دھوکہ میں ہے، اس کی مثال اس مریض کی سی ہے جو کسی طبیب کے مطب میں بیٹھتا ہے، اور نسخے سنتا رہتا ہے، لیکن اس سے اس کو صحت نہیں ہو سکتی، یا ایک بھوکا آدمی کسی سے کھانے کے انواع واقسام کی فہرست سنتا ہے، اس سے اس کی بھوک نہیں مٹ سکتی، اور اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا، اسی طرح سے طاعات و اعمال کی تشریح و تفصیل کا سنتے رہنا اللہ کے یہاں کچھ کام نہیں آئے گا۔ اسی طرح سے ہر وعظ جو تمہاری حالت میں ایسا تغیر نہ پیدا کرے جس سے تمہارے اعمال میں تغیر ہو جائے، اور اللہ تبارک و تعالٰی کی طرف انابت اور رجوع (قوی ہو یا ضعیف) پیدا ہو اور دنیا سے بے رغبتی اور اعراض پیدا ہو وہ وعظ تمہارے لیے وبال اور تمہارے خلاف ایک دلیل کا کام

دے گا۔ اگر تم خالی خولی وعظ کو وسیلۂ نجات اور ذریعہ مغفرت سمجھتے ہو تو دھوکہ میں ہو"[1]۔

ایک اصلاحی وتربیتی کتاب

لیکن احیاء العلوم نری تنقیدی کتاب نہیں ہے، وہ اصلاح وتربیت کی ایک جامع اور مفصل کتاب ہے، اس کے مصنف نے ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کی کوشش کی ہے، جو ایک طالب حق کے لیے اپنی اصلاح وتربیت اور دوسروں کی تعلیم وتبلیغ کے لیے تنہا کافی ہو سکے اور بڑی حد تک ایک وسیع اسلامی کتب خانہ کی قائم مقامی کر سکے اور دینی زندگی کا دستور العمل بن سکے، اس لیے یہ کتاب عقائد وفقہ[2]، تزکیۂ نفس وتہذیب اخلاق اور حصول کیفیت احسانی (جس کے مجموعہ کا نام تصوف ہے) تینوں شعبوں کی جامع ہے اس کتاب کی ایک نمایاں صفت اس کی تاثیر ہے، مولانا شبلی کے اس تاثر میں ہزاروں پڑھنے والے شریک ہوں گے کہ "احیاء العلوم" میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے، ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے، ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے، ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانہ میں لکھی گئی، خود امام صاحب تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے"[3]۔

مصنف کے ان حالات وکیفیات کا (جو اس سفر اور کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ان پر طاری تھیں، اور جن سے یہ کتاب متاثر ہوئی ہے) پڑھنے والوں پر بعض اوقات یہ اثر پڑتا ہے کہ دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو جاتا ہے، زہد وتقشف کا ایک شدید اور بعض اوقات غیر معتدل رجحان پیدا ہوتا ہے، خوف وہیبت کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو کبھی کبھی صحت ومشاغل پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے کہ خود مصنف پر اس کتاب کی تصنیف

---

1 احیاء العلوم الدین ج ۳ ص ۳۵۲

2 امام غزالی چونکہ شافعی ہیں، اور فقہ شافعی کا اس زمانہ میں زور بھی تھا، اس لیے اس کتاب میں انھوں نے فقہ شافعی ہی کو اختیار کیا ہے۔

3 الغزالی ص ۳۳

کے زمانہ میں ہیبت کا غلبہ تھا، اس لیے بہت سے مشائخ مبتدیوں کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ نہیں دیتے، اعتدال کامل اور توازن صحیح تو صرف سیرت نبویؐ اور احادیث کے مجموعہ کے مطالعہ اور کسی نمونہ کامل کی صحبت و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

احیاء العلوم اور فلسفہ اخلاق

امام غزالیؒ صرف ایک بلند پایہ فقیہ ایک صاحب اجتہاد متکلم اور ایک صاحبِ دل صوفی نہیں ہیں، اخلاقیات اسلامی اور فلسفہ اخلاق کے ایک نامور مصنف اور ایک دقیق النظر اور نکتہ رس ماہر اخلاق و نفسیات بھی ہیں، اخلاق اسلامی اور فلسفہ اخلاق کی کوئی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی[1]۔ احیاء العلوم اس موضوع پر بھی ان کا ایک کارنامہ ہے، امراضِ قلب اور کیفیاتِ نفسانی پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی دقت نظر اور سلامتِ فکر کا نمونہ ہے، یہاں اس کا بھی ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

حبِّ جاہ

احیاء العلوم میں سبب "بیان سبب کون الجاہ محبوباً بالطبع حتی لا یخلو عنہ قلب الا بشدید المجاھدۃ" (جاہ انسان کو کیوں طبعی طور پر محبوب ہے یہاں تک کہ شدید مجاہدہ کے بغیر کسی قلب کا بھی اس سے خالی ہونا مشکل ہے) کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

> "معلوم ہونا چاہیے کہ جس بنا پر سونا چاندی اور مال کی بقیہ اقسام محبوب ہیں، بعینہ اسی بنا پر جاہ بھی محبوب ہوتا ہے، بلکہ جس طرح سونا چاندی سے زیادہ محبوب ہے، خواہ وہ مقدار میں برابر ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح جاہ کو مال پر فوقیت حاصل ہونا چاہیے، یہ تو تمہیں معلوم ہی

---

1 ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد محمد یوسف موسیٰ استاد جامعۃ القاہرۃ کی تصنیفات "تاریخ الاخلاق" اور "فلسفہ الاخلاق و صلاتھا بالفلسفۃ الاغریقیۃ"

ہے کہ درہم و دینار کی ذات میں کوئی کشش اور معنویت نہیں، اس لیے نہ وہ کھانے کے کام کے ہیں، نہ پینے کے، نہ شادی بیاہ کے نہ پوشاک ولباس کے، اپنی ذات کے لحاظ سے تو وہ اور ٹکیاں برابر ہی ہیں، لیکن ان دونوں میں کشش اور محبوبیت محض اس بنا پر ہے کہ وہ محبوبات کا ذریعہ اور خواہشات کی تکمیل کا سامان ہیں، یہی معاملہ جاہ کا ہے، اس لیے کہ جاہ دلوں کی تسخیر کا نام ہے، اور جس طرح سے سونے چاندی کی ملکیت ایسی قدرت عطا کرتی ہے جس سے انسان اپنے تمام اغراض و مقاصد تک پہونچ سکتا ہے، اسی طرح سے بندگانِ خدا کے قلوب کی تسخیر تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر سونا چاندی اور جاہ انسان کو محبوب ہے لیکن محبوبیت میں شریک ہونے کے ساتھ جاہ کو مال پر کئی وجہ سے ترجیح حاصل ہے، اور اس کی محبوبیت مال کی محبوبیت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اس کے تین نمایاں اسباب ہیں، پہلا سبب تو یہ ہے کہ جاہ کے ذریعہ سے مال تک پہنچنا، مال کے ذریعے جاہ تک پہنچنے کے مقابلہ میں آسان ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عالم یا زاہد جس کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے، اگر مال حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں اس لیے کہ لوگوں کے مال و دولت ان لوگوں کے دلوں کے تابع ہوتے ہیں، اب اگر ان کے دل کسی کے تابع ہو جائیں تو ان کے مال بھی اسی کے تابع ہو جائیں گے، اور وہ اپنی دولت بھی اسی کے قدموں پر نثار کر دیں گے، اس کے برخلاف ایک کم مرتبہ اور ذلیل آدمی جس میں کمال کی کوئی صفت نہیں ہے، اگر اس کو کوئی خزانہ بھی مل جائے اور اس کو وہ جاہ حاصل نہیں ہے، جس سے وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکے، اگر اس مال کے ذریعہ جاہ تک پہنچنا چاہے گا تو نہیں پہنچ سکے گا

اس لیے کہ جاہ مال کا آلہ اور وسیلہ ہے، جو جاہ کا مالک ہے، وہ بآسانی مال کا بھی مالک بن سکتا ہے، لیکن جو مال کا مالک ہے، وہ ہر حالت میں جاہ کا مالک نہیں بن سکتا، اس لیے جاہ مال سے زیادہ محبوب ہوا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مال کے لیے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی آزمائش میں آ جائے، چوری یا غصب کے ذریعہ تلف ہو جائے، بادشاہ اور ظالم بھی اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں، یوں بھی اس کو محافظوں، پہرہ داروں اور محفوظ صندوقوں کی ضرورت ہے، پھر بھی اس کے لیے ہزار خطرے ہیں، لیکن دل جب کسی کا غلام بن جائے، تو ان کے لیے کوئی آفت نہیں وہ دراصل محفوظ خزانے ہیں، جو چوروں، غارت گروں اور غاصبین کی دست رس سے باہر ہیں۔ ملکیتوں میں سب سے محفوظ ملکیت زمین اور جائداد ہے، لیکن اس میں بھی غاصبانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کا خطرہ ہے، اور پہرہ اور حفاظت کی اس کو بھی ضرورت ہے لیکن دلوں کے خزانے خود ہی محفوظ و مامون ہیں، اور جاہ کو کسی غصب و سرقہ کا خطرہ نہیں، ہاں دلوں پر بھی تھوڑا بہت تصرف کیا جا سکتا ہے، اور جس سے عقیدت مندی ہے، اس کی طرف سے اعتقاد پھیرا جا سکتا ہے اور بدگمانی پیدا کی جا سکتی ہے، لیکن اس کا ازالہ مشکل نہیں اور ایسا عمل ہر ایک کے لیے آسان نہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ قلوب کی ملکیت میں ازدیاد و نمو اور اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور اس کے لیے کسی محنت و جفاکشی کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ قلوب جب کسی شخص کے علم یا عمل کی وجہ سے اس کے حلقہ بگوش اور معتقد ہو جاتے ہیں تو زبانیں اس کے کلمات کا کلمہ پڑھنے لگتی ہیں، لوگ دوسروں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور نئے نئے دل اس کے مفتوح ہوتے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر انسان طبعی طور پر شہرت اور ناموری کا دلدادہ

ہے، اس لیے کہ جب اس کا چرچا دوسرے شہروں اور ملکوں میں ہوتا ہے، نئے نئے دل شکار ہوتے ہیں اور اس کے حلقہ بگوش بنتے ہیں، اسی طرح اس کی محبت و عظمت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی اور بڑھتی رہتی ہے، اور کہیں جا کر رکتی نہیں، برخلاف مال کے کہ جو جتنی مقدار کا مالک ہے اس کا مالک ہے، اس میں بغیر سخت محنت اور جانفشانی کے اضافہ نہیں ہو سکتا، لیکن جاہ خود بخود نمو پذیر ہے، اور اس کی کوئی حد نہیں، مال میں ٹھہراؤ اور وقوف ہے، جاہ پھلتا پھولتا رہتا ہے، اسی لیے جب جاہ میں ترقی ہو جاتی ہے اور شہرت عام حاصل ہو جاتی ہے اور لوگ کسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں تو مال و دولت اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتا ہے، یہ تو مال کی جاہ پر ترجیح کے نمایاں اسباب ہیں، اگر تفصیل کی جائے تو اور بہت سے وجوہ نکلیں گے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ ہے کہ انسان کو مال و جاہ سے اسی قدر محبت ہونی چاہیے کہ ان کے ذریعہ لذتیں حاصل کر کے اور کلفتیں دور کر دے، اس لیے کہ مال و جاہ محبوبات کا ذریعہ ہیں، اور محبوبات کے حصول کا ذریعہ بھی محبوب ہوتا ہے لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ بات یہیں جا کر نہیں رکتی، اور انسان اموال کے جمع کرنے، خزانہ پر خزانہ اور ذخیرہ پر ذخیرہ کرنے میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ضروریات کی سرحد کو بھی پار کر جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا وہ حال ہو جاتا ہے (جو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے) کہ اگر بندے کے پاس سونے کی دو گھاٹیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہشمند ہو گا۔ اسی طرح سے انسان جاہ میں وسعت و ترقی کی فکر میں رہتا ہے، اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شہرت ان دور دراز ملکوں تک

بھی پہنچ جائے، جن کے متعلق وہ قطعی طور پر جانتا ہے کہ وہ ان ملکوں میں کبھی قدم بھی نہیں رکھے گا، اور کبھی وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کی بھی امید نہیں کہ ان کی تعظیم سے اس کو خوشی حاصل ہو گی یا وہ اپنی دولت اس پر خرچ کریں گے، یا اس کی غرض بر آری کریں گے، یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو اس سے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے، اور دل میں اس کا مزہ لیتا رہتا ہے کہ اس کا ان ملکوں میں چرچا ہو اور اس کو وہاں جاہ حاصل ہو، بظاہر یہ ایک حماقت کی بات معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ یہ ایک ایسی چیز کی خواہش ہے جس کا دنیا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی جاہ کی ایسی محبت دلوں کی ایک عمومی کیفیت ہے، جس کا ازالہ ممکن نہیں، اس کے دو سبب ہیں، ایک جلی جس کا ادارک سب کر سکتے ہیں، دوسرا خفی جو بڑا سبب ہے، لیکن اتنا نازک ہے کہ غبی تو غبی ذکی بھی اس کو بمشکل محسوس کر سکتے ہیں، اس لیے کہ اس کا تعلق نفس و طبیعت کی ایک ایسی خاصیت سے ہے جس کا علم باریک بین اور ان اشخاص کو ہے جو طبائع انسانی کی گہرائیوں میں غوطہ لگا سکتے ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان فطرۃً محبوب کے بارہ میں بدگماں واقع ہوا ہے، اور خطرات کو دور کرنا چاہتا ہے۔

عشق است و ہزار بدگمانی

انسان کی بسر اوقات کے لیے خواہ ضروری سامان موجود ہو، لیکن اس کی آرزوئیں بہت طویل ہوتی ہیں، اس کے دل میں بار بار یہ خطرہ گذرتا ہے، کہ جو مال فی الحال اس کی ضروریات کے لیے کافی ہے شاید تلف ہو جائے اور اس کو دوسرے مال کی ضرورت ہو، جب اس کے دل میں اس کا خیال آتا ہے تو اس کے دل میں فکر و غم کا جوش اٹھتا

ہے، یہ خلش اس کی جبھی دور ہو سکتی ہے، جب اس کو دوسرے مال کے جانے سے اطمینان حاصل ہو جائے کہ اگر یہ پہلا مال ضائع ہو گیا، یا اس پر کوئی آفت آئی تو یہ دوسرا مال موجود ہے، اپنی ذات سے دلچسپی اور زندگی کی محبت کی بنا پر اپنی زندگی کا بہت طویل اندازہ لگاتا ہے، اور نئی نئی ضرورتوں کے پیش آنے کا حق رکھتا ہے، اور نئے نئے خطروں اور نئی نئی آفتوں کو فرض کرتا رہتا ہے، اور ان کے تصور سے لرزہ براندام رہتا ہے، اس لیے ان خطروں کو زائل کرنے کے وسائل سوچتا رہتا ہے، اور اس کا سب سے بڑا وسیلہ اس کی نظر میں یہ ہے کہ مال اتنا کثیر ہو کہ اگر اس کے کسی حصہ پر کوئی زد پڑے تو دوسرے حصہ سے وہ اپنا کام نکال سکے، یہ خوف اور فکر مندی اس کو مال کی کسی مخصوص مقدار پر قانع نہیں ہونے دیتی، اور وہ کسی حد پر بھی جا کر نہیں ٹھہرتا یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی مِلک بنالینے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ”دو حریص ایسے ہیں، جو کبھی سیر نہیں ہوتے، علم کا حریص اور مال کا حریص“ بعینہٖ یہی علت دور دراز کے شہروں اور بیگانہ لوگوں کے دلوں میں اعتقاد اور جاہ پیدا ہونے کی خواہش میں ہوتی ہے، حب جاہ کا مریض بھی ان خیالی خطرات کو سوچتا رہتا ہے، جو پیش آسکتے ہیں ہو سکتا ہے اس کو اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑے، ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کے شہر میں آجائیں اور اس کو ان سے کام پڑ جائے، اور جب تک یہ سب کچھ ممکن ہے اور یہ کوئی ناممکن الوقوع بات نہیں ہے کہ اس کو ان کی ضرورت پڑے، نفس کو اس بات کی فرحت ولذت ہوتی ہے کہ اس کا اعتقاد اور عظمت ان بعید الوطن لوگوں کے دل میں قائم ہے جن سے کبھی کام پڑ سکتا ہے۔

دوسرا سبب جو زیادہ طاقت ور ہے، وہ یہ کہ روح ایک امر ربانی ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّي حکم ربانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم مکاشفہ کے اسرار میں سے ہے، اور اس کے اظہار کی اجازت نہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حقیقت کا اظہار نہیں فرمایا، لیکن اس کی حقیقت کا علم حاصل کیے بغیر بھی تم کو اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ قلب میں ایک تو بہیمی صفات (کھانے پینے اور جماع) کا میلان پایا جاتا ہے، ایک میلان درندوں کی صفات قتل و ضرب و ایذا کا اور ایک شیطانی صفات مکر و فریب کا اور اسی کے ساتھ ایک میلان صفات ربوبیت کبر و عظمت، عزت و تجبر اور سربلندی کا بھی پایا جاتا ہے، اس لیے کہ قلب انسانی مختلف اصول و عناصر سے مرکب ہے جن کی شرح و تفصیل میں بڑی طوالت ہے، قلب میں امر ربانی کا جو حصہ ہے، اس کی بنا پر انسان کے اندر طبعی طور پر ربوبیت کی خواہش پائی جاتی ہے، ربوبیت کیا ہے؟ کمال میں یکتائی اور مستقل وجود جو کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہو، اس لیے کمال صفاتِ الوہیت میں سے ہے، اور وہ انسان کو بالطبع محبوب ہے، اور کمال یہی ہے کہ وجود میں یکتا ہو، اس لیے کہ وجود میں کسی اور کی شرکت یقیناً ایک نقص ہے، آفتاب کا کمال یہ ہے کہ وہی ایک آفتاب ہے، اگر کوئی دوسرا آفتاب ہوتا تو یہ اس آفتاب کے چہرہ کمال کے لیے داغ ہوتا، اس لیے کہ وہ اپنی شان آفتابی میں یکتا نہ ہوا اس لیے کہ وجود کی یکتائی اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کو حاصل ہے اس لیے اس کے سامنے کوئی موجود (حقیقی) نہیں اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اس کی قدرت کا کرشمہ ہے جو اپنے بل بوتے پر نہیں رہ سکتا وہ اسی کے سہارے قائم ہے تو در حقیقت اس کے سامنے

کوئی موجود ہی نہیں اس لیے کہ معیت کے لیے رتبہ کی مساوات ضروری ہے۔ اور رتبہ کی مساوات کمال کے لیے نقص ہے۔ کامل وہی ہے جس کا کوئی ہم مرتبہ نہ ہو اور جس طرح آفتاب کے نور کی تابش آفاق عالم میں آفتاب کا نقص نہیں بلکہ اس کا کمال ہے، آفتاب کے لیے نقص تو دوسرے ہم مرتبہ آفتاب کا وجود ہے، جبکہ اس کی ضرورت بھی نہیں، اسی طرح سے عالم میں ہر چیز کا وجود انوارِ قدرت کی تابش کا فیضان ہے، یہ سب تابع ہیں، متبوع نہیں، پس ربوبیت کی شان وجود کی یکتائی ہے، اور یہی کمال ہے، انسان بھی بالطبع اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہ کمال میں یکتا ہو، بعض مشائخ صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ہر انسان کے باطن میں وہی بات مضمر ہے جس کو فرعون نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی لیکن اس کو اس کا موقع نہیں ملتا[1]۔

عبودیت نفس اسی لیے نفس پر شاق اور ربوبیت اسی لیے طبعاً سہل اور مرغوب ہے، یہ اسی نسبت ربانی کی وجہ سے ہے، جس کی طرف "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" میں اشارہ ہے۔

لیکن جب انتہائے کمال تک پہونچنے سے عاجز رہا تو اس کے کمال کی خواہش بالکلیہ زائل نہیں ہوئی، اب بھی وہ کمال کا خواہش مند اور متمنی ہے، اور اس کو کمال سے بالذات لذت حاصل ہوتی ہے، کمال کے علاوہ کسی اور مقصود کی خاطر نہیں (جس کا کمال ذریعہ ہے) بلکہ نفسِ کمال کی خاطر، دنیا میں جو بھی موجود ہے، اس کو اپنی ذات سے محبت اور اپنی ذات کے کمال سے محبت ہے اور ہر ایک کو ہلاکت اور

1 مولانا روم نے اس مضمون کو بیان کیا ہے:

نفس ما را کمتر از فرعون نیست
لیک او را عون ما را عون نیست

فنا نامرغوب ہے، اس لیے کہ اس میں اپنی ذات اور اپنی صفاتِ کمال کا فنا سمجھتا ہے، کمال تو یہی ہے کہ وجود میں یکتائی حاصل ہو اور تمام موجودات پر غلبہ اور حکمرانی، اس لیے کہ کامل ترین کمال یہ ہے کہ دوسرے کا وجود تمہارا ہی رہینِ منت ہو، اگر وہ تمہارا رہینِ منت نہیں ہے تو کم از کم اتنا ہو کہ تم اس پر غالب ہو، اس بنا پر سب پر غلبہ حاصل کرنا انسان کو طبعی طور پر محبوب ہے، اس لیے کہ یہ کمال کی ایک قسم ہے۔ ہر موجود جو اپنی ذات کا شناسا ہے وہ اپنی ذات کا عاشق ہے اور اپنی ذات کے کمال کا بھی عاشق ہے، اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، اگر کسی چیز پر غلبہ کے معنٰی یہ ہیں کہ تم اس پر اثر ڈال سکو، اپنے ارادہ کے مطابق اس میں تغیر کر سکو اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرو، انسان نے چاہا تو یہ تھا کہ اس کو تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہو جائے لیکن موجودات میں سے کچھ موجود ایسے ہیں جو کسی تغیر کو قبول نہیں کرتے، جیسے اللہ کی ذات و صفات، اور بعض موجود ایسے ہیں جو تغیر کو قبول کرتے ہیں، لیکن ان پر مخلوق کی کوئی دست رس نہیں، اور اس پر ان کا کوئی زور نہیں چلتا، جیسے افلاک و کواکب، ملکوت، سماوات، نفوس، ملائکہ، جن و شیاطین اور جیسے پہاڑ و سمندر اور ان کے بیچ کی چیزیں، تیسری قسم وہ ہے جس میں انسان اپنی قدرت سے تغیر کر سکتا ہے، جیسے زمین اور اس کے اجزائے معدنیات، نباتات، حیوانات، اور انہی میں سے انسانوں کے دل بھی ہیں، جو بدن ہی کی طرح تاثر اور تغیر قبول کرتے ہیں، جب موجودات کی ایک قسم وہ ہوئی جن پر انسان تصرف کی قدرت رکھتا ہے، جیسے ارضیات، اور ایک وہ جن پر قدرت نہیں رکھتا، جیسے ذات الٰہی، ملائکہ، افلاک، تو انسان کے اندر اس کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کم

سے کم آسمانوں کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے، ان کی حقیقت کو سمجھے اور ان کے اسرار کو فاش کرے، اس لیے کہ یہ بھی ایک طرح کا غلبہ ہے، اس لیے جس کا پورا پورا علم حاصل ہو جاتا ہے وہ علم کے ماتحت ہو جاتا ہے اور عالم ایک طرح سے غالب کی شان رکھتا ہے، (گویا اس علم سے اس کے جذبۂ حکومت و استعلاء کی کسی درجہ میں تسکین ہوتی ہے) اسی بنا پر اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، ملائکہ، افلاک، کواکب، عجائب، سمٰوات، سیاروں اور سمندروں کے عجائب وغیرہ کے علم کا شوق ہوتا ہے اس لیے کہ یہ ایک طرح کا تغلب ہے اور تغلب کمال کی ایک قسم ہے۔ اسی بنا پر تم دیکھتے ہوگے کہ جو شخص کوئی عجیب چیز بنا نہیں سکتا وہ کم سے کم اس کے بنانے کا طریقہ جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے (گویا اسی طرح سے وہ صنعت کی خواہش کی تسکین کرتا ہے) جو شطرنج وضع کرنے سے عاجز ہے، وہ کم سے کم شطرنج کھیلنے کا طریقہ سیکھ لینا چاہتا ہے، اور یہ جاننا چاہتا ہے، کہ شطرنج کیسے بنائی گئی ہے، جو شخص کسی ہندسہ یا شعبدہ یا جرّ ثقیل کے آلے کو دیکھتا ہے، اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسا آلہ بنانے سے قاصر ہے، تو وہ اس کے بنانے کی کیفیت جاننا چاہتا ہے اس کو اپنے اس عجز سے تکلیف اور علم کے کمال سے لذت حاصل ہوتی ہے، گو وہ اس کی کمی اس سے پوری کرنا چاہتا ہے۔

دوسری قسم جس پر انسان قدرت حاصل کر سکتا ہے، جیسے ارضیات وغیرہ تو وہ طبعی طور پر ان پر غلبہ اور اتنی قدرت حاصل کرنا چاہتا ہے، کہ ان میں اپنی منشا کے مطابق تصرف کر سکے، اس کی بھی دو قسمیں ہیں، اجسام اور ارواح، اجسام تو روپیہ پیسہ سامان ہے، ان کے بارہ میں تو انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو،

وہ ان کو اٹھا بٹھا سکے، جس کو چاہے دے، جس کو چاہے نہ دے اس لیے کہ یہ قدرت ہے، اور قدرت کمال ہے اور کمال صفاتِ ربوبیت میں سے ہے اور ربوبیت بالطبع محبوب، اسی لیے اس کو اموال کی محبت ہے چاہے اس کو اپنے پہننے کھانے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کبھی بھی اس کی ضرورت نہ ہو، اسی طرح سے غلام رکھنا، اور آزاد شریف لوگوں کو اپنا غلام بنانا خواہ زبردستی اور تغلب سے ہو، یہاں تک کہ ان کے اجسام اور ان کی ذات میں تصرف کر سکے، یعنی بیگار لے سکے، چاہے ان کے دل غلام نہ بنیں، اس لیے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غلاموں کے دل میں اس کا اعتقاد نہیں ہوتا اور ان کو اس سے محبت نہیں ہوتی لیکن کبھی محض غلبہ بھی محبت کا قائم مقام ہو جاتا ہے، انسان کو ایسا رعب داب بھی لذیذ اور عزیز ہے جو زبردستی کی بنا پر ہو اس لیے کہ اس میں قدرت کا اظہار ہوتا ہے، اور انسان اس کا دیوانہ ہے۔

دوسری قسم آدمیوں کے نفوس اور قلوب ہیں، اور یہ روئے زمین کی سب سے زیادہ بیش قیمت اور نفیس چیز ہے، اور انسان چاہتا ہے کہ اس کو ان قلوب پر غلبہ و قدرت حاصل ہو جائے تاکہ وہ اس کے لیے مسخر ہو جائیں اور اس کے ایک اشارہ پر کام کریں، اس لیے کہ اس میں غلبہ کا کمال پایا جاتا ہے، اور صفاتِ ربوبیت سے مشابہت ہے۔ قلوب صرف محبت سے مسخر ہوتے ہیں اور محبت کمال کے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے کہ ہر کمال محبوب ہے، اور کمال اس لیے محبوب ہے کہ وہ صفات الٰہیہ میں سے ہے اور صفاتِ الٰہیہ سب انسان کو بالطبع محبوب ہیں اس لیے کہ انسان میں ایک نسبتِ ربانی پائی جاتی ہے اور یہ نسبت غیر فانی ہے، نہ موت اس کو ختم کر سکتی ہے، اور نہ

مٹی اس پر قابو پا سکتی ہے، یہی نسبت ربانی ایمان و معرفت کا محل ہے، وہی بقائے الٰہی تک پہنچنے والی ہے اور وہی اس کے لیے کوشش کرنے والی ہے۔ جاہ کے معنی قلوب کا مسخر ہونا ہے، اور جس کے لے قلوب مسخر ہو گئے، اس کو ان پر قدرت و استیلاء حاصل ہو گیا اور قدرت و استیلاء کمال ہے، اور کمال اوصافِ ربوبیت میں سے ہے، پس قلب کو جو چیز بالطبع محبوب ہے وہ کمال ہے جو خواہ علم سے حاصل ہو، خواہ قدرت سے۔ مال و جاہ بھی اسبابِ قدرت میں سے ہیں، اس لیے کہ وہ محبوب کا وسیلہ ہیں، اور محبوب کا وسیلہ بھی محبوب ہوتا ہے، پھر نہ معلومات کی کوئی انتہا ہے نہ مقدورات کی کوئی انتہا ہے اور جب تک کہ ایک چیز بھی دنیا میں باقی ہے، جو معلوم کی جا سکتی ہے، اور ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے جس پر قدرت حاصل کی جا سکتی ہے تو نہ شوق کو سکون ہے اور نہ نقص کو زوال اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو حریص کبھی آسودہ نہیں ہو سکتے"[1]۔

محاسبہ نفس

کتاب کا موثر ترین حصہ ہے وہ جہاں امام غزالیؒ نصیحت اور ترغیب و ترہیب پر قلم اٹھاتے ہیں، اور دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی عظمت، ایمان و عمل صالح کی ضرورت، اصلاح و تہذیب نفس کی اہمیت اور امراضِ قلبی و نفسانی کی مضرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، اس موقع پر وہ بیک وقت ایک شیوہ بیان واعظ ایک نکتہ شناس حکیم اور ایک تجربہ کار ماہر نفسیات معالج کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو اپنے مخاطبین کے حالات اور کمزوریوں اور ضرورتوں سے خوب واقف ہے وہ ان کی طرف سے ان سے بہتر وکالت کرتا ہے اور بڑی قابلیت اور انصاف کے ساتھ ان کے عذر اور دلائل پیش کرتا ہے، پھر ایک ماہر مقنن و عالم

1 احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۲۴۱، ۲۴۴

نفسیات کی طرح ان میں سے ایک ایک کا جواب دیتا ہے، پھر ایک شفیق معالج اور ایک خیر خواہ مربی کی طرح ان کا علاج تجویز کرتا ہے، اس لیے ان کے مواعظ صرف واعظانہ تاثیر ہی کا نمونہ نہیں، حکمت و بلاغت کا بھی نمونہ ہیں۔ ہر دور میں ہزاروں آدمیوں نے ان کے مواعظ و مکالمات سے فائدہ اٹھایا ہے، اور کثیر التعداد آدمیوں کی اصلاح و انقلاب کا ذریعہ بنے ہیں، کتاب کے آخری چوتھے حصہ (ربع رابع) میں اس کا بڑا ذخیرہ ہے، یہاں اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جہاں انھوں نے نفس کو زجر و توبیخ کی ہے، اور پڑھنے والوں کو تعلیم دی ہے کہ ان کو اپنے نفس سے کس طرح مکالمہ کرنا چاہیے اور منزلِ آخرت کے لے کس طرح اس کو تیار کرنا چاہیے "المرابطة السادسة فی توبیخ النفس و معاتبتها" عنوان کے تحت نفس سے مکالمہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اے نفس ذرا انصاف کر اگر ایک یہودی تجھ سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں لذیذ ترین کھانا تیرے لیے مضر ہے تو تو صبر کرتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے' اور اس کی خاطر تکلیف اٹھاتا ہے، کیا انبیا کا قول جن کو معجزات کی تائید حاصل ہوتی ہے، اور فرمان الٰہی اور صحفِ سماوی کا مضمون تیرے لیے اس سے بھی کم اثر رکھتا ہے، جتنا کہ اس یہودی کا ایک قیاس و اندازہ۔ عقل کی کمی اور علم کی کمی اور کوتاہی کے ساتھ تعجب ہے اگر ایک بچہ کہتا ہے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے، تو بغیر دلیل طلب کیے اور سوچ سمجھے اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے، کیا انبیاء، علماء، اولیاء اور حکما کی متفقہ بات تیرے نزدیک اس بچہ کی بات سے بھی کم وقعت رکھتی ہے؟ یا جہنم کی آگ، اس کی بیڑیاں، اس کے گرز، اس کا عذاب، اس کا زقوم اور اس کے آنکڑے اس کے سانپ، بچھو اور زہریلی چیزیں تیرے لیے ایک بچھو سے بھی کم تکلیف دہ ہیں، جس کی تکلیف زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے کم رہتی ہے یہ عقلمندوں کا شیوہ نہیں، اگر کہیں بہائم کو تیری حالت کا علم ہو جائے' تو وہ تجھ پر

ہنسیں اور تیری دانائی کا مذاق اڑائیں، پس اگر اے نفس! تجھ کو یہ سب چیزیں معلوم ہیں، اور ان پر تیرا ایمان ہے، تو کیا بات ہے کہ تو عمل میں تساہل اور ٹال مٹول سے کام لیتا ہے، حالانکہ موت کمیں گاہ میں منتظر ہے کہ وہ بغیر مہلت کے تجھے اُچک لے جائے، اور فرض کر کہ تجھے سو برس کی مہلت بھی مل گئی ہے تو کیا تیرا خیال ہے کہ جس کو ایک گھاٹی طے کرنی ہے اور وہ اس گھاٹی کے نشیب میں اطمینان سے اپنے جانور کو کھلا رہا ہے، وہ کبھی بھی اس گھاٹی کو طے کر سکے گا؟ اگر تو گمان رکھتا ہے تو تو کس قدر نادان ہے، ایسے شخص کے بارہ میں تیری کیا رائے ہے، جو علم حاصل کرنے کی غرض سے پردیس کا سفر کرتا ہے، اور وہاں کئی سال بیکاری اور تعطل میں گزار دیتا ہے، اس خیال سے کہ وطن کی واپسی کے سال سب علم حاصل کرے گا، تو اس کی عقل پر ہنستا ہے اور اس کے اس وہم کا مذاق اڑاتا ہے کہ علم و تفقہ اتنی قلیل مدت میں حاصل ہو جائے گا، یا قضا کا منصب بغیر علم و تفقہ کے توکل کی برکت سے ہاتھ آجائے گا، پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آخر عمر کی کوشش مفید ہوتی ہے، اور بلند درجات تک لے جاتی ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی آج کا دن تیری عمر کا آخری دن ہو تو اس دن تو اس کام میں کیوں مشغول نہیں ہوتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے بتلا بھی دیا ہے کہ تجھے مہلت دے دی گئی ہے تو پھر بھی عجلت کرنے سے کیا چیز مانع ہے، اور آج کل، آج کل کرنے کی کیا وجہ ہے یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ تجھے اپنی خواہشات نفس کی مخالفت مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں محنت و مشقت ہے۔ کیا تو اس دن کا منتظر ہے جب خواہشات کی مخالفت تیرے لیے آسان ہو جائے گی؟ ایسا دن تو اللہ تعالیٰ نے مطلق پیدا ہی نہیں کیا اور نہ پیدا کرے گا۔ جنت ہمیشہ ناگواریوں اور

مکارہ سے گھری رہے گی، اور مکارہ کبھی نفس کے لیے آسان نہیں ہو سکتے، ایسا ہونا محال ہے، کتنا ایسا ہوتا ہے کہ تو کہتا ہے کہ کل سے یہ کام کریں گے تجھے معلوم نہیں کہ جو کل آچکی ہے، وہ گزشتہ دن کے حکم میں ہے۔ جو کام تو آج انجام نہیں دے سکا کل اس کا انجام دینا تیرے لیے اور بھی مشکل ہے اس لیے کہ شہوت کی مثال ایک تناور درخت کی سی ہے جس کو آدمی اکھاڑنا اپنا فرض سمجھتا ہے، اگر کوئی اس کو اکھاڑنے سے عاجز ہو گیا اور اس نے اس کو کل پر رکھا تو اس کی مثال اس نوجوان کی سی ہے جس سے ایک درخت اکھاڑا نہیں گیا اور اس نے اس کام کو دوسرے سال کے لیے ملتوی کر دیا وہ جانتا ہے کہ جتنا زمانہ گزرے گا درخت مستحکم اور اس کی جڑیں مضبوط اور وسیع ہو جائیں گی، اور اکھاڑنے والے کی کمزوری اور ضعف میں اضافہ ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جس کو شباب میں نہیں اکھاڑ سکا اس کو بڑھاپے میں کیا اکھاڑے گا' بڑھاپے کی ورزش اور محنت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے، بھیڑیئے کی تربیت و اصلاح ایک عذاب ہے، سرسبز شاخ لچک رکھتی ہے اور جھکائی جاسکتی ہے، جب سوکھ جائے گی اور ایک زمانہ گزر جائے گا تو اس کا موڑنا ناممکن ہو جائے گا۔ پس اگر اے نفس! تو ان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا اور سہل انگاری سے کام لیتا ہے تو تجھے کیا ہو گیا ہے کہ حکمت و دانش کا دعویدار ہے۔ اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ غالباً تو یہ کہے کہ استقامت سے روکنے والی چیز شہوت پرستی اور آلام و مصائب پر بے صبری ہے، اگر یہی بات ہے تو تیری عبادت کتنی بڑھی ہوئی ہے اور تیرا عذر کتنا لنگ ہے۔ اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ایسی لذت کیوں نہیں تلاش کرتا جو تمام کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو اور ابد الآباد تک کے لیے ہو اور یہ نعمت جنت ہی میں

حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر تو خواہشات کا حریص ہے اور تجھے لذت ہی عزیز ہے، تو ان کی خاطر بھی تجھے نفس کی وقتی خواہشات کی مخالفت کرنی چاہیے اس لیے کہ بسا اوقات ایک لقمہ کئی لقموں سے محروم کر دیتا ہے۔ تیرا کیا خیال ہے اس مریض کے بارے میں جس کو طبیب نے صرف تین روز کے لیے ٹھنڈے پانی سے پرہیز بتایا ہو تا کہ وہ صحت حاصل کر سکے پھر زندگی بھر ٹھنڈے پانی کا لطف اٹھائے، اس نے اس کو خبردار کر دیا ہو کہ ٹھنڈا پانی اس حالت میں اس کے لیے سخت مضر ہے، اگر اس نے بدپرہیزی کی تو زندگی بھر اس ٹھنڈے پانی سے اس کو ہاتھ دھو لینا پڑے گا۔ اس وقت سچ سچ بتلا عقل کا تقاضا کیا ہے کیا اس کو تین دن صبر کر لینا چاہیے، تا کہ زندگی آرام سے گذرے' یا اپنی خواہش پوری کر لینی چاہیے، پھر تین سو دن یا تین ہزار دن برابر اس نعمت سے محروم رہے؟ تین دن کی کبھی پوری عمر کے مقابلہ میں وہ حقیقت نہیں جو تیری پوری عمر کی ابد الآباد کی زندگی کے مقابلہ میں ہے (جو اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کی مدت ہے) کیا تو کہہ سکتا ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کے ضبط کرنے کی تکلیف طبقاتِ جہنم میں عذابِ نار سے زیادہ سخت اور طویل ہے؟ جو شخص ایک معمولی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا وہ عذابِ الٰہی کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ میں دیکھتا ہوں کہ تو دو وجہ سے اپنے نفس کو ڈھیل دیتا ہے، ایک "کفر خفی" اور ایک صریح حماقت، کفر خفی یہ ہے کہ یومِ حساب پر تیرا ایمان کمزور ہے اور ثواب و عقاب سے تو ناواقف ہے اور صریح حماقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر مخفی اور اس کے استدراج کا خیال کیے بغیر اس کے عفو و کرم پر اعتماد ہے، اس کے باوجود کہ تو روٹی کے ایک ٹکڑے، غلہ کے ایک دانہ اور زبان سے نکلے ہوئے ایک کلمہ کے لیے

خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، بلکہ اس کے حصول کے لیے ہزار جتن کرتا ہے اور اسی جہالت کی وجہ سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہے کہ الکیس من دان نفسہ و عمل لما بعد الموت والاحمق من اتبع نفسہ ھواھا و تمنی علی اللہ الامانی (ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے، اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگا دے، اور اللہ پر آرزوئیں باندھتا رہے) افسوس اے نفس! تجھ کو زندگی کے دام ہم رنگ زمین سے ہوشیار رہنا چاہیے تھا اور شیطان سے فریب نہیں کھانا چاہیے تھا، تجھے اپنے اوپر ترس کھانا چاہیے، تجھے اپنی ہی فکر کا حکم دیا گیا ہے، دیکھ تو اپنے اوقات ضائع نہ کر، تیرے پاس گنی چنی سانسیں ہیں، اگر تیری ایک سانس بھی رائگاں گئی تو گویا تیرے سرمایہ کا ایک حصہ ضائع ہو گیا پس غنیمت سمجھ صحت کو مرض سے پہلے، فراغت کو مصروفیت سے پہلے، دولت کو غربت سے پہلے، شباب کو ضعیفی سے پہلے، زندگی کو ہلاکت سے پہلے اور آخرت کے لیے تیاری کر اسی لحاظ سے جتنا تجھے وہاں رہنا ہے، اے نفس! کیا جب موسم سرما سر پر آ جاتا ہے تو اس پوری مدت کے لیے تو تیاری نہیں کرتا؟ خوراک کا ذخیرہ، لباس کی ضروری مقدار اور ایندھن کا ایک ڈھیر جمع نہیں کر لیتا؟ تو تمام ضروری سامان جاڑے کا مہیا کر لیتا ہے اور اس بھروسہ پر نہیں رہتا کہ لبادۂ جڑ اول اور ایندھن کے بغیر جاڑا گزار دے گا' اور تجھ میں اس کی طاقت ہے؟ کیا تیرا گمان ہے کہ جہنم کی زمہریر، جاڑوں کی سخت سردی سے کم ہے؟ ہرگز نہیں اور اس کا کوئی امکان نہیں شدت و برودت میں ان دونوں کے درمیان کوئی تناسب

نہیں، کیا تو سمجھتا ہے کہ تو بغیر سعی کے اس سے نجات حاصل کر لے گا جیسے کہ سردی بغیر اونی کپڑے، لبادۂ آگ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بغیر نہیں جاتی، اسی طرح دوزخ کی گرمی اور سردی توحید کے قلعہ اور طاعت کے خندق کے بغیر نہیں جاسکتی اور اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہے کہ اس نے تجھے حفاظت کی تدابیر سے آگاہ کر دیا ہے اور اسباب آسان کر دیے ہیں اس کا کرم یہ نہیں کہ وہ سرے سے عذاب ہی کو ٹال دے۔' اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے، وہ جاڑا پیدا کرتا ہے تو اس کے لیے آگ بھی پیدا کرتا ہے اور تجھے چقماق کے طریقہ پر پتھروں سے آگ نکالنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے کہ تو ان طریقوں سے فائدہ اٹھائے اور اپنے کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھے اور جیسے کہ لکڑی خریدنا اور اونی کپڑے حاصل کرنا، خدا کی ضرورت نہیں انسانوں کی ضرورت ہے اسی طرح طاعت وعبادت سے بھی خدا مستغنی ہے اور یہ تمہارا فریضہ ہے کہ اس کے وسیلہ سے نجات حاصل کرو مَن احسن فلنفسه و من اساء فعليها والله غنى عن العالمين (جس نے اچھائی کی تو اپنے نفس کے لیے اور جس نے برائی کی اس کا بوجھ بھی اسی پر ہے اور اللہ جہان والوں سے بے پروا ہے) تیری خرابی ہو اے نفس! جہالت کی قبا چاک کر اور اپنی آخرت کو اپنی دنیا پر قیاس کر۔ فما خلقكم ولا بعثكم الا كنفس واحده (تمہارا پیدا کرنا اور تمہارا برپا کرنا ایک جان کی طرح ہے) كما بدانا اول خلق نعيده (جیسے ہم نے پیدا کیا تھا پھر اسے دہراتے ہیں) كما بداكم تعودون (جیسے اس نے تم کو ابتداء

پیدا کیا تھا، ویسے ہی پھر تم واپس ہو جاؤ گے)[1]۔

احیاء کے ناقد

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے احیاء العلوم کی اجمالی تعریف و اعتراف کیا ہے، اور لکھا ہے کہ کلامہ فی الاحیا غالبہ جید[2] (احیاء میں عموماً ان کا کلام اچھا ہے) اس کے ساتھ وہ چار باتوں میں اس کتاب پر تنقید کرتے ہیں، ان کی پہلی تنقید اس پر ہے کہ اس میں فلاسفہ کے بہت سے اقوال آ گئے ہیں، اور توحید نبوت اور معاد سے متعلق ان کے بعض خیالات و بیانات شامل ہو گئے ہیں۔ ان کے نزدیک امام غزالیؒ فلاسفہ کے اثرات سے ضرور کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے ہیں۔ وہ اگرچہ ان کے بڑے ناقد اور مخالف ہیں، مگر ان کی تصنیفات میں ان کے خیالات کی (غیر شعوری طور پر) کہیں کہیں جھلک آ جاتی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی حس فلسفہ و فلاسفہ کے بارہ میں چونکہ بہت تیز ہے اس لیے کچھ عجب نہیں کہ ان کے معیار سے امام غزالیؒ کی بعض چیزیں فلسفہ سے متاثر ہوں۔

دوسری تنقید یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے کلامی مباحث ہیں جو ابن تیمیہؒ کے نزدیک کتاب و سنت کی روح کے پورے طور پر مطابق نہیں ہیں، اور ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ تیسری تنقید یہ ہے کہ اس میں اہلِ تصوف کے بعض متشددانہ اقوال اور مغالطے ہیں۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ احیا میں بہت سی ضعیف احادیث و آثار ہیں، بلکہ موضوع روایات تک ہیں[3]۔ اس کے باوجود شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں:

و فیہ مع ذلك من كلام المشائخ الصوفية العارفين المستقيمين فی اعمال القلوب الموافق للكتاب والسنة ماهو اكثر مما يرد منه فلهذا اختلف فيه

---

1 احیاء علوم الدین ج ۴ ص ۳۵۲، ۳۵۸

2 فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

3 فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ص ۱۹۴، اور "التاج المکلل" نواب صدیق حسن خان ص ۳۸۸

اجتہاد الناس و تنازع عوافیہ

اس کے باوجود احیاء میں ان مشائخ صوفیہ کا جو صاحب معرفت و استقامت تھے اعمال قلوب کے بارہ میں بہت سا ایسا کلام ہے، جو کتاب و سنت کے موافق ہے اور جس کا اکثر حصہ قابلِ قبول ہے اسی بنا پر اس کتاب کے بارہ میں علماء مختلف آراء رکھتے ہیں اور سب اس کے مخالف نہیں۔

علامہ ابن جوزیؒ کی بھی بڑی تنقید ضعیف اور موضوع روایتوں پر ہے۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ امام صاحب کا حدیث سے عدم اشتغال ہے[2]۔ حافظ زین الدین العراقیؒ "صاحبِ الفیہ" نے احیاء کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے کہ اس کی احادیث کی تخریج کی، ہر راوی اور حدیث کا درجہ اور اس کی حیثیت بیان کر دی ہے۔

ابن جوزیؒ نے امام غزالیؒ کے بعض تاریخی مسامحات اور فروگذاشتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی طرح ان کو تاریخ سے بھی اشتغال کا موقع نہیں ملا تھا[3]۔

ان کا دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ بعض امراضِ قلب (ریا و حُبِّ جاہ) وغیرہ کے علاج کے سلسلہ میں اور نفس کُشی اور اصلاح کے لیے انہوں نے صوفیہ کے بعض ایسے واقعات نقل کر دیے ہیں جو قابلِ تقلید نہیں ہیں، اور فقہی حیثیت سے ان کا جواز بھی ثابت ہونا مشکل ہے[4]۔ ان نقائص کے باوجود وہ احیاء علوم کی اہمیت و مقبولیت کے قائل ہیں، اور انھوں نے خود "منہاج القاصدین" کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے جس میں انھوں نے قابلِ اعتراض چیزوں کو حذف کر دیا ہے لیکن اس خلاصہ میں اصل کتاب کی روح اور اس کی

---

1 فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۲ ص ۱۹۴

2 المنتظم ج ۹ ص ۱۶۹، ۱۷۰

3 ایضاً

4 ایضاً ص ۱۶۹

تاثیر باقی نہیں رہی ہے۔

امام غزالیؒ اور علم کلام

امام غزالیؒ جس مجتہدانہ دماغ کے آدمی تھے، اس کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ مقتدمین کے مباحث و تحقیقات کے ناقل محض یا ترجمان و شارح بن کر رہ جائیں اور کہیں ان کی شخصیت نمودار نہ ہونے پائے۔ بد قسمتی سے چوتھی صدی میں علم کلام کا حلقہ بھی (جس کو تمام دوسرے علمی اداروں سے زیادہ اپنے زمانہ کی عقلی اور علمی سطح کے ساتھ چلنے کی ضرورت تھی) جمود و تقلید کا شکار ہو گیا تھا۔ متکلمین اشاعرہ کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ ان کے نتائج تحقیقات اور ان کے عقائد تسلیم کیے جائیں، بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کے ثبوت کے لیے امام ابوالحسن اشعریؒ اور علامہ ابو بکر باقلانیؒ وغیرہ نے جو مقدمات و دلائل قائم کیے ہیں، ان کو بھی بعینہٖ تسلیم کیا جائے اور ان کے علاوہ دوسرے مقدمات و دلائل سے کام نہ لیا جائے امام غزالیؒ نے اپنی تصنیفات میں مجتہدانہ انداز میں اصول و عقائد پر گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لیے انھوں نے بعض ایسے نئے مقدمات و دلائل قائم کیے جو ان کے نزدیک زیادہ موثر و دلپذیر تھے، صفاتِ باری تعالیٰ، نبوت، معجزات، تکلیفاتِ شریعہ، عذاب و ثواب، برزخ، قیامت کے متعلق انھوں نے متکلمانہ انداز سے گفتگو کی، اور ان کے ثبوت کے لیے انھوں نے بہت سے متکلمین کی طرح احتمال آفرینیوں، تشکیکات اور منطقی مقدمات و نتائج کے بجائے زیادہ عام فہم اور اطمینان بخش دلائل فراہم کیے اور اس سلسلے میں انھوں نے پیشرو متکلمین کے استدلال، زبان اور اصطلاحات اور ان کی ترتیب کی پابندی نہیں کی، اور اس طرح اشعری علم کلام کی تجدید کی خدمت انجام دی، جس کے لیے متکلمین اشاعرہ کو ان کا ممنون اور ان کی عظیم الشان دینی خدمت کا معترف ہونا چاہیے تھا مگر چونکہ انھوں نے یہ کام عام متکلمین کی روش سے ہٹ کر انجام دیا تھا اور کہیں کہیں امام ابوالحسن اشعری اور ان کے نامور متبعین کی تحقیقات سے اختلاف پایا جاتا تھا، اس لیے اشعری مکتب فکر (جس سے خود امام صاحب منسلک، اور منسوب تھے) ان کے اس علم کلام اور ان دلائل و مقدمات پر چیں بجبیں تھا اور اس حلقہ کے بہت سے پر جوش علما اس میں زیغ و ضلال اور

مسلکِ سلف سے بُعد و انحراف محسوس کرتے تھے، احیاء العلوم کی تالیف اور اس کی غیر معمولی اشاعت و مقبولیت کے بعد اس مسئلہ پر اشعری علماء میں چہ میگوئیاں بہت بڑھ گئیں اور بہت سے لوگوں کو امام صاحب کے عقائد میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ کسی مخلص نے امام صاحب کو خط لکھا اور اس صورتِ حال کی اطلاع دیتے ہوئے اپنی قلبی تکلیف کا اظہار کیا امام صاحب نے ان کو مفصل جواب دیا۔ ایک مستقل رسالہ (فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ) کے نام سے موجود ہے، اس کے شروع میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"برادرِ شفیق! حاسدین کا گروہ جو میری بعض تصنیفات (متعلق باسرار دین) پر نکتہ چینی کر رہا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ تصنیفات قدمائے اسلام اور مشائخ اہل کلام کے خلاف ہیں، اور یہ کہ اشعری کے عقیدے سے بال برابر بھی ہٹنا کفر ہے، اس پر جو تم کو صدمہ ہوتا ہے اور تمہارا دل جلتا ہے میں اس سے واقف ہوں لیکن عزیز من! تم کو صبر کرنا چاہیے۔ جب رسول اللہ ﷺ مطاعن سے نہ بچ سکے، تو میری کیا ہستی ہے؟ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ اشاعرہ یا معتزلہ یا حنابلہ، یا اور دیگر فرقوں کی مخالفت کفر ہے تو سمجھ لو کہ وہ اندھا مقلد ہے، اس کی اصلاح کی کوشش میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، اس کو خاموش کرنے کے لیے مخالفین کا دعویٰ کافی ہے۔ اس لیے کہ تمام مذاہب (کلامیہ) میں اشعری سے اختلاف پائے جاتے ہیں، اب اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ تمام تفصیلات و جزئیات میں اشعری کا اتباع ضروری ہے، اور ادنیٰ مخالفت بھی کفر ہے تو اس سے سوال کرو کہ یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ حق اشعری کے ساتھ مخصوص ہے، اور انہی کی اتباع میں منحصر ہے، اگر ایسا ہے تو وہ شاید باقلانی کے کفر کا فتویٰ دیں گے، اس لیے کہ صفت بقا میں ان کو اشعری سے اختلاف ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ ذاتِ الٰہی سے زائد کوئی صفت نہیں ہے، اور پھر

سوال یہ ہے کہ باقلانی ہی اشعری کی مخالفت کر کے کیوں کفر کے مستحق ہیں۔ اشعری باقلانی سے اختلاف کی بنا پر کیوں کفر کے مستحق نہیں، اور حق ان میں سے کسی ایک میں کیوں منحصر سمجھا جائے؟ اگر کہا جائے کہ اشعری متقدم ہیں، تو خود اشعری سے معتزلہ متقدم ہیں، تو پھر معتزلہ کو بر سرِ حق ہونا چاہیے یا یہ محض علم و فضل کے تفاوت کی بنا پر ہے؟ تو بتلایا جائے کہ علم و فضل کا موازنہ کرنے کے لیے کون سا ترازو ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنے پیشوا کو علم و فضل میں سب سے بلند مرتبہ مانتا ہے، اگر باقلانی کو اشعری سے اختلاف کرنے کی اجازت ہے، تو باقلانی کے بعد آنے والے اس حق سے کیوں محروم رہیں اور اس میں کسی ایک شخص کی تخصیص کیوں کی جائے[1]۔

علم کلام پر مجتہدانہ گفتگو اور اس میں بیش بہا اضافہ کرنے کے بعد امام غزالیؒ اپنی سلامتِ طبع، حق پسندی اور ذاتی تجربوں کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ علم کلام کا فائدہ بہت محدود ہے، اور بعض اوقات اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہے، نیز وہ ایک وقتی اور ضرورت کی چیز ہے، اور ایک دوا ہے، جس کی صحیح المزاج اور سلیم الطبع انسانوں کو ضرورت نہیں، عموی چیز جو ایک صالح غذا کا حکم رکھتی ہے، اور جس سے کوئی انسان مستغنی نہیں وہ قرآن مجید کا طرزِ بیان اور استدلال ہے جس سے سب کو اپنا اپنا حصہ ملتا ہے، اور کوئی اس سے محروم نہیں "الجام العوام عن علم الکلام" میں جو ان کی آخری تصنیف ہے، لکھتے ہیں:

فأدلة القرآن مثل الغذاء و ینتفع به کل انسان وادلة المتکلمین مثل الدواء و ینتفع بالماد الناس و یستضربه الاکثرون بل ادلة القرآن کالماء الذی ینتفع به الصبی الرضیع والرجل القوی و سآئر الادلة کالاطعمة التی

---

1 فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ

ينتفع بها الاقوياء مرة و يمرضون بها اخرى ولا ينتفع بها لصبيان اصلا

قرآنی دلائل غذا کی طرح ہیں جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے، اور متکلمین کے دلائل دوا کی طرح ہیں جس سے کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور اکثر آدمیوں کو اس سے نقصان ہوتا ہے، بلکہ قرآنی دلائل کی مثال پانی کی سی ہے، جس سے دودھ پیتا بچا اور طاقتور آدمی یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں باقی دلائل (کلامیہ) کھانے کے انواع و اقسام کی طرح ہیں کہ کبھی ان سے طاقت ور آدمیوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور کبھی ضرر اور بچوں کے لیے وہ مطلقاً کارآمد نہیں۔

علم کلام سے جو نقصان پہنچا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنا مشاہدہ اور تجربہ بیان کرتے ہیں۔

والدليل على تضرر الخلق به المشاهدة والعيان و التجربة و ما ثار من الشر منذ نبغ المتكلمون و فشت صناعة الكلام مع سلامة العصر الاول من الصحابة عن مثل ذلك

لوگوں کو علم کلام سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی دلیل خود مشاہدہ اور تجربہ ہے، اہل تجربہ جانتے ہیں کہ جب سے متکلمین پیدا ہوئے اور علم کلام کا چرچا ہوا کیسی مصیبت آئی اور خرابی پھیلی، صحابہ کا دور اس خرابی سے محفوظ تھا۔

تدریس کے لیے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت

ذوالقعدہ ۴۹۹ھ میں غزالی نے نیشاپور کے مدرسۂ نظامیہ کی مسندِ درس کو دوبارہ آباد کیا تھا، یہ سنجر سلجوقی (پسر ملک شاہ) کی سلطنت، اور فخر الملک (پسر نظام الملک) کی وزارتِ عظمیٰ کا زمانہ تھا، (فخر الملک) محرم ۵۰۰ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا،

1 الجام العوام عن علم الکلام ص ۲

اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد امام نے مدرسہ نظامیہ کی تدریس سے کنارہ کشی کی اور اپنے وطن طوس میں سکونت اختیار کی، گھر کے پاس ہی ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی جہاں تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔

۵۰۰ھ میں سلطان محمد بن ملک شاہ نے جب نظام الملک کے بڑے بیٹے احمد کو وزیر اعظم مقرر کیا تو اس نے امام صاحب کو پھر بغداد میں بلانا چاہا، امام غزالی کی جگہ مدرسہ نظامیہ میں اگرچہ پر کر دی گئی تھی، مگر خالی تھی۔ امام غزالی کا جانشین پورے عالم اسلامی میں ملنا مشکل تھا، مدرسہ نظامیہ سلطنت عباسیہ کی زینت اور بغداد کی آبرو تھی، اس نقصان کا احساس سب کو تھا، بارگاہِ خلافت سے بھی اس کی تحریک ہوئی کہ امام غزالیؒ مدرسہ نظامیہ کو پھر زینت بخشیں، قوام الدین نظام الملک وزیر اعظم نے خود خط لکھا، اور مدرسہ نظامیہ کی اہمیت اور مرکزیت بیان کی، اور خود خلیفہ عباسی کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ وہ لکھتا ہے:

> و نیز از سرائے عزیز مقدس نبوی (یعنی ایوان خلافت) ذریعت نمودند و تدبیر آں را مبالغہا فرمودند، وایں خطاب صادر نشد، تا صدر الدین[1] بہ تحفظ ایں خبر بخواجہ اجل زین الدین حجۃ الاسلام، فرید الزمان، ابو حامد محمد بن محمد الغزالی ادام اللہ تمکنہ، اہتمام نہ گیرد از انچہ او یگانہ جہاں و قدوہ عالم و انگشت نمائے روزگار است"۔

اس فرمان پر دربارِ خلافت کے تمام ارکان کے دستخط ثبت تھے، اور یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ "حاشیہ بوسانِ خلافت اور ارکانِ سلطنت سب امام صاحب کے قدوم کے لیے چشم براہ ہیں۔ احمد بن نظام الملک نے خود امام صاحب کو جو خط لکھا اس کا ماحصل یہ تھا کہ اگرچہ آپ جہاں تشریف رکھیں گے وہی جگہ درسگاہِ عام بن جائے گی لیکن جس طرح آپ مقتدائے روزگار ہیں، آپ کی قیام گاہ بھی وہی شہر ہونا چاہیے جو عالمِ اسلام کا مرکز اور قبلہ گاہ ہو، تاکہ تمام دنیا کے ہر حصہ کے لوگ بآسانی وہاں پہنچ سکیں اور ایسا مقام صرف دارالسلام بغداد

---

[1] صدر الدین محمد نظام الملک طوسی کا پوتا اور سلطان سنجر کا وزیر اعظم تھا، جس کی حکومت میں طوس واقع تھا

ہے"۔

امام صاحب نے ان خطوط و فرامین کے جواب میں ایک طول طویل خط لکھا، اور بغداد میں نہ آنے کے متعدد عذر لکھے۔ ایک یہ کہ یہاں (طوس میں) ڈیڑھ سو مستعد طلبہ مصروف تحصیل ہیں، جن کو بغداد جانے میں زحمت ہو گی۔ دوسرے یہ کہ جب میں پہلے بغداد گیا تھا تو میرے اہل و عیال نہ تھے، اب بال بچوں کا جھگڑا ہے، اور یہ لوگ ترک وطن کی زحمت نہیں اٹھا سکتے، تیسرے یہ کہ میں نے مقام خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا اور بغداد میں مباحثہ کے بغیر چارہ نہیں، اس کے سوا دربارِ خلافت میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہونا ہو گا، اور میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا اور بغداد میں میری کوئی جائیداد نہیں غرض خلافت اور سلطنت کی طرف سے گو بہت کچھ کد ہوئی، لیکن امام صاحب نے صاف انکار کیا، اور گوشہ عافیت سے باہر نہ نکلے۔[1]

بقیہ زندگی اور وفات

امام غزالیؒ نے یہ زمانہ علمی و دینی اشتغال میں گذارا، ان میں اب بھی طالب علمانہ روح تھی، وہ حدیث کی طرف ایسی توجہ نہیں کر سکے تھے، جیسی انھوں نے علومِ عقلیہ اور بعض علومِ نقلیہ کی طرف کی تھی، اس زمانہ میں ان کو اپنی اس کمی کو پورا کرنے کا خیال ہوا، چنانچہ ایک مشہور محدث حافظ عمر بن ابی الحسن الرواسی کو اپنے یہاں مہمان رکھ کر ان سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کا درس لیا، اور اس کی سند حاصل کی، یہ اخیر زمانہ ان کا حدیث کے مطالعہ اور اشتغال میں گذرا، ابنِ عساکر کہتے ہیں:

> و کانت خاتمة امرہ اقباله علی حدیث المصطفیٰ صلی الله علیه وسلم و مجالسة اهله و مطالعة الصحیحین البخاری و مسلم الذین هما حجة الاسلام[2]

---

1 الغزالی ص ۲۱

2 تبئین کذب المفتری ص ۲۹۶

ان کی زندگی کا آخری کام یہ تھا کہ وہ حدیثِ نبوی کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور علماء حدیث کی ہم نشینی اختیار کی اور صحیحین (بخاری و مسلم) کا مطالعہ شروع کیا جو اسلام میں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

انتقال سے ایک سال پہلے ۵۰۴ھ میں انھوں نے "المستصفیٰ" لکھی، جو اصولِ فقہ کے ارکانِ ثلثہ میں شمار کی جاتی ہے،[1] اور علمانے اس کے ساتھ بڑی اعتنا کی ہے، یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔

امام غزالی نے طابران میں ۱۴ر جمادی الاخری ۵۰۵ھ کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا اور یہ گنج گرانمایہ اسی خاک میں ودیعت ہوا۔ ابن جوزی نے ان کے انتقال کا واقعہ ان کے بھائی احمد غزالیؒ کی روایت سے اس طرح بیان کیا ہے:

دوشنبہ کے دن وہ صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا "آقا کا حکم سر آنکھوں پر" یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیے لوگوں نے دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی۔[2]

امام غزالیؒ کی دو ممتاز خصوصیتیں

امام غزالی کی دو خصوصیتیں بڑی ممتاز ہیں۔ اخلاص، علو ہمت، ان کے اخلاص کا اعتراف موافق و مخالف سب کو ہے اور وہ ان کی تصنیفات کے لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اگرچہ ان کے ناقد ہیں، اور ان کی بہت سی چیزوں سے ان کو اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان کو کبار مخلصین میں شمار کرتے ہیں، ان کی کتابوں کی تاثیر اور

---

1 یہ تین کتابیں جو اصولِ فقہ کے تین ستون سمجھے جاتے ہیں حسبِ ذیل ہیں ابوالحسین البصری کی (المعتمد) امام الحرمین کی (البرہان) اور امام غزالی کی (المستصفیٰ)

2 اتحفا السادۃ المتقین

مقبولیت کی اصل وجہ ان کا یہی اخلاص ہے، اسی اخلاص نے ان سے اقلیم علم کی مسند شاہی ترک کروائی، اور برسوں دشت و بیاباں کی خاک چھنوائی، اور باوجود طلبی و اصرار کے بادشاہوں کے دربار اور اپنے وقت کے سب سے بڑے اعزاز سے روگرداں اور بے نیاز رکھا، انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آخری چیز جو صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے، وہ حبِ جاہ ہے۔ ان کی آخری زندگی شہادت دیتی ہے کہ وہ اس مقام سے محروم نہیں رہے۔

علو ہمت ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہے، انھوں نے علم و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہمعصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی وہ علم و عمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہنچے ان کے کانوں میں یہی صدا آئی کہ

ع

مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

علوم نقلیہ میں بھی وہ اپنے زمانہ اور اپنے معاصرین کی عام سطح سے بہت بلند ہیں، فقہ، اصول فقہ میں انھوں نے جو تصنیفات کیں، صدیوں تک علماء ان کی شرح و تحشیہ میں مشغول رہے پھر اپنے زمانہ کے رواج اور علمائے نقلیات کے دستور کے خلاف انھوں نے علومِ عقلیہ کی طرف توجہ کی اور منطق و فلسفہ کا اس طرح مطالعہ کیا کہ بقول قاضی ابو بکر بن العربیؒ "فلسفہ کے جگر اور فلاسفہ کے شکم میں اتر گئے" اور پھر ان کی تنقید و تردید میں ایسی کتابیں لکھیں، جن سے اس کی عمارت ایک صدی تک متزلزل رہی۔

عمل کے سلسلہ میں اپنی ذہنی، علمی، اخلاقی، اور روحانی ترقی و تکمیل کا انھوں نے کوئی گوشہ فرو گزاشت نہیں کیا، علمی تبحر اور جامعیت و کمال کے ساتھ اپنے وقت کے ایک مخلص و مبصر شیخ طریقت شیخ ابو علی فارمدی (م ۴۷۷ھ) سے بیعت کی، اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، پھر اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے اس کے مقاصد و غایات کو پہونچے، اور اذواق صحیحہ سے لذت آشنا ہوئے۔

اصلاح و انقلاب کے سلسلہ میں صرف تصنیف و تالیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک نئی اسلامی سلطنت کی داغ بیل پڑنے میں بھی ان کا ہاتھ ہے، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

امام صاحب کو ان باتوں پر تسلی نہ تھی، وہ دیکھتے تھے کہ موجودہ سلطنتوں کا سرے سے خمیر ہی بگڑ گیا ہے، اس لیے جب تک اسلامی اصول کے موافق ایک نئی سلطنت نہ قائم کی جائے، اصل مقصد نہیں حاصل ہو سکتا لیکن امام صاحب کو ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ سے اتنی فرصت نہ تھی کہ ایسے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکتے، اتفاق یہ کہ جب احیاء العلوم شائع ہوئی اور ۵۰۱ھ میں اسپین میں پہنچی تو علی بن یوسف بن تاشفین نے جو اسپین کا بادشاہ تھا، تعصب اور تنگ دلی سے اس کتاب کے جلانے کا حکم دیا۔[1] اور نہایت بیدردی سے اس حکم کی تعمیل کی گئی، امام صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو سخت رنج ہوا، اسی اثنا میں اسپین سے ایک شخص امام صاحب کی خدمت میں تحصیلِ علم کے لیے آیا، جس کا نام محمد بن عبد اللہ تومرت تھا۔ یہ ایک نہایت معزز خاندان کا آدمی تھا اور اس کے آباء و اجداد ہمیشہ سے آزادی پسند اور صاحب حوصلہ چلے آئے تھے۔ امام صاحب کی خدمت میں رہ کر اس نے تمام علوم میں نہایت کمال پیدا کیا اور اپنے ذاتی حوصلہ یا امام صاحب کے فیضِ صحبت سے یہ ارادہ کیا کہ اسپین میں علی بن یوسف کی سلطنت کو مٹا کر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالے۔ یہ خیال اس نے امام صاحب کے سامنے پیش کیا، امام صاحب چونکہ خود ایک عادلانہ سلطنت کے خواہش مند تھے، نے اس رائے کو پسند کیا لیکن پہلے یہ دریافت کیا کہ اس مہم کے انجام دینے کے اسباب بھی مہیا ہیں یا نہیں؟ انھیں محمد بن عبد اللہ[2] نے اطمینان دلایا تو امام صاحب نے

---

1 شرح احیاء العلوم

2 چونکہ محمد بن عبد اللہ نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی اور اسی اصول پر قائم کی جو امام غزالی کا منشا تھا، اس لیے اس کا ایک مختصر سا حال طبقات الشافعیہ ابن السبکی سے نقل کرتے ہیں:

نہایت خوشی سے اجازت دی علامہ ابن خلدون اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

و بقی فیما زعموا اباحامد الغزالی و فاوضہ بذات صدرہ فارادہ علیہ لما کان فیہ الاسلام یومئذ باقطار الارض من اختلال الدولۃ و تقویض ارکان السلطان الجامع للامۃ المقیم للملۃ بعد ان سالہ عمن لہ من العصابۃ والقبائل التی یکون بہا الاعتزاز والمنعۃ

جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے، وہ ابو حامد غزالی سے ملا اور ان سے اپنے دلی خیالات کے متعلق مشورہ کیا، امام صاحب نے اس کی تائید کی کیونکہ اس زمانہ میں اسلام تمام دنیا میں ضعیف ہو رہا تھا اور کوئی ایسا سلطان موجود نہ تھا جو تمام امت کو متحد کر سکے اور دین واسلام کو قائم رکھے لیکن پہلے امام صاحب نے اس سے پوچھ لیا کہ تمہارے پاس اتنا سر و سامان اور جمعیت ہے یا نہیں جس سے قوت اور حفاظت ہو سکے۔

"محمد بن عبداللہ اقصائے مغرب کا رہنے والا تھا، اول اپنے وطن میں نشو ونما پایا پھر مشرق کا سفر کیا اور فقہ و کلام کی تحصیل کی وہ نہایت پرہیزگار عابد اور قناعت پسند تھا، فارغ التحصیل ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر کمربستہ ہوا، مصر میں پہنچا تو اس سختی سے لوگوں کو مناہی سے روکا کہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے اور اس کو شہر بدر کر دیا، مصر سے اسکندریہ اور چند روز وہاں اقامت کی پھر بلاد مغرب کی طرف روانہ ہوا، ۵۰۵ھ میں مہدیہ پہنچا اور اپنے کام میں مشغول ہوا، وہاں سے چل کر بجایہ، بجایہ سے مراکش گیا یہاں بھی نہایت آزادی سے امر بالمعروف کی خدمت انجام دی، یہاں تک کہ خود شاہی خاندان سے معترض ہوا، بادشاہِ وقت علی بن یوسف تاشفین نے اس کو دربار میں طلب کیا، دربار کے علماء نے اس سے کہا کہ ایسے عادل اور منصف بادشاہ کی حکومت سے ناراضگی کی کیا وجہ بیان کر سکتے ہو، محمد بن عبداللہ نے نہایت جوش کے ساتھ کہا کہ کیا اس شہر میں علانیہ شراب کی خرید و فروخت نہیں ہوتی؟ اور کیا یتیموں کے مال پر دست درازی نہیں کی جاتی؟ اس کی پرجوش تقریر سے بادشاہ بھی متاثر ہوا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ محمد مراکش سے نکل کر اغمات میں آیا اور رفتہ رفتہ ایک جماعت کثیر اس کے ساتھ ہو گئی، پھر تیمل میں قیام کر کے قبیلۂ مصامدہ کی اعانت سے سلطنت کی بنیاد ڈالنی شروع کی اور کامیاب ہوا۔

غرض محمد بن عبداللہ بن تومرت نے واپس جا کر امر بالمعروف کے شعار سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو مدت تک قائم رہی اور موحدین کے لقب سے پکاری جاتی تھی علی بن یوسف کی حکومت میں جور و تعدی بہت پھیل گئی تھی، فوج کے لوگ علانیہ لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے، اور عفت ماب خاتونوں کے ناموس کو برباد کرتے تھے، علی بن یوسف کے خاندان میں ایک مدت سے یہ الثاد ستور چلا آتا تھا کہ مرد منہ پر نقاب ڈالتے تھے اور عورتیں کھلے منہ پھرتی تھیں، اس لحاظ سے یہ لوگ "ملثمین" کہلاتے تھے محمد بن تومرت نے اول اول انہی دونوں بدعتوں کے مٹانے پر کمر باندھی، اور رفتہ رفتہ اسی سلسلہ میں ملثمین کی حکومت برباد ہو کر ایک نئی سلطنت قائم ہو گئی۔ محمد بن تومرت نے خود فرمانروائی کا قصد نہیں کیا، بلکہ ایک لائق شخص کو جس کا نام عبدالمومن تھا تخت نشین کیا۔

عبدالمومن اور اس کے خاندان نے جس طرز پر حکومت کی وہ بالکل اس اصول کے موافق تھی، جو امام غزالی کی تمنا تھی، ابنِ خلدون کتابِ ثالث "اخبار بربر" فصل ثالث میں عبدالمومن اور اس کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں:

> ان کی حکومت کا یہ انداز تھا کہ علما کی عزت کی جاتی تھی، اور تمام واقعات اور معاملات میں ان سے مشورہ لے کر کام کیا جاتا تھا، داد خواہوں کی فریاد سنی جاتی تھی، رعایا پر عمال ظلم کرتے تو ان کو سزا دی جاتی تھی، ظالموں کا ہاتھ روک دیا گیا تھا، شاہی ایوانوں میں مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں، تمام سرحدی نا کے جہاں یورپ کا ڈانڈا ملتا تھا فوجی طاقت سے مضبوط کر دیے گئے تھے اور غزوات و فتوحات کو روز افزوں ترقی تھی۔[1]

امام غزالیؒ کا عالمِ اسلام پر اثر

ان علمی و عملی کمالات، طاقتور اور جامع شخصیت کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے عالم

---

1 الغزالی ص ۱۱۷۔۱۱۶

اسلام پر گہرا اثر ڈالا ان کی عہد آفریں تصنیفات اور مباحث علمی نے علمی حلقوں میں ایک ذہنی تموج اور فکری حریت پیدا کر دی اور ان کو نئی غذا اور طاقت پہنچائی، اسلام کی جو چند شخصیتیں صدیوں تک عالم اسلام کے دل و دماغ پر اور اس کے علمی و فکری حلقوں پر حاوی رہی ہیں، ان میں سے ایک امام غزالی کی شخصیت بھی ہے، جن کی اثر آفرینی، علمی پایہ ان کی تصنیفات کی اہمیت اور تاثیر مخالف اور موافق اور سب کو تسلیم رہی ہے، صدہا انقلابات کے بعد ان کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے، اور ان کی تصنیفات ایک بڑے حلقہ میں وقیع اور مقبول ہیں، اور پڑھنے والوں کو آج بھی متاثر کرتی ہیں۔

عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت و اصلاح عام اور بغداد کے داعی الی اللہ

امام غزالیؒ کی موثر شخصیت ان کے علمی و اصلاحی کارناموں کی عظمت کے باوجود عموی دعوت و تذکیر کی ضرورت باقی تھی، مسلمانوں کی بڑی تعداد علمی شبہات اور خصوصی امراض کے بجائے عام اخلاقی کمزوریوں عملی کوتاہیوں اور غفلت اور جہالت کا شکار تھی، اور اس کا جلد مداوا ضروری تھا، اس لیے فوری طور پر ایک سحر بیان خطیب اور ایک ایسی بلند روحانی شخصیت کی ضرورت تھی، جس کا عوام سے زیادہ ربط ہو، اور جو اپنی دعوت و مواعظ، تزکیہ و اصلاح سے جمہور اہلِ اسلام میں دینی روح، اور نئی ایمانی زندگی پیدا کر دے، مطلق العنان حکومت نے چار سو برس تک مسلمانوں کے اخلاق کو متاثر کیا تھا، اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کا مقصدِ زندگی حصولِ دولت یا جاہ و عزت تھا، اور جو اگرچہ اعتقادی طور پر جزاء و آخرت کا منکر نہ تھا مگر عملاً خدا فراموش، آخرت سے غافل اور عیش میں مست تھا۔ عجمی تہذیب و معاشرت نے بھی اسلامی زندگی میں اپنے پنجے گاڑھ رکھے تھے، اور عجمی عادات اور جاہلی رسوم جزو زندگی بن گئی تھیں۔ زندگی کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا، سوسائٹی کے مطالبات بہت بڑھ گئے تھے، حکام رس، مزاج شناس اور موقع پرست لوگوں کی ایک مستقل قوم پیدا ہو گئی تھی۔ متوسط طبقہ امراء کے نقش قدم پر تھا اور عوام اور محنت

کش متوسط طبقہ کے اخلاق و عادات سے متاثر ہو رہے تھے، جن کو وسائل معیشت حاصل تھے، وہ غلط طریقہ پر ان کو استعمال کر رہے تھے، اور زندگی سے تمتع اور لطف اندوزی میں مصروف تھے جو امیرانہ ٹھاٹھ سے محروم تھے، وہ کوفت میں مبتلا تھے اور اپنے کو چوپایہ سے بدتر سمجھتے تھے، اہل دولت ایثار و ہمدردی اور جذبہ شکر سے خالی اور تنگ حال اور محنت کش، صبر و قناعت اور یقین و خودداری سے محروم ہوتے جارہے تھے، اس طرح زندگی ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا تھی، اس وقت ایک ایسی دعوت کی ضرورت تھی، جو دنیا طلبی کے بحران کو کم کرے، ایمان کو بیدار کرے اور آخرت کے یقین کو ابھارے، خدا طلبی کا ذوق پیدا کرے، اللہ تعالیٰ کی سچی معرفت، اس کی بندگی اور رضامندی میں عالی ہمتی اور بلند حوصلگی سے کام لے اور اس راستہ میں سبقت کرنے کی دعوت دے، توحید کامل کو واشگاف بیان کیا جائے، اہل دنیا اور اربابِ دولت کی بے وقعتی اور اسباب کی کمزوری کو طاقت اور وضاحت سے بیان کیا جائے۔

داعی کی علمی صلاحیتیں

پانچویں صدی تاریخ اسلام میں علوم وفنون کی ترقی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، اس صدی میں دینی، عقلی اور ادبی علوم میں بڑے بڑے باکمال اور ائمہ فن پیدا ہوئے ہیں، اسی صدی کے آخر میں علامہ ابو اسحٰق شیرازی (م ۴۷۶ھ) اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) جیسے متبحر عالم اور صاحب فنون، ابو الوفا ابنِ عقیل (م ۵۰۲ھ) جیسے فقیہ اور محقق، عبدالقاہر جرجانی (م ۴۷۱ھ) جیسے صاحبِ ذوق اور مجتہد فن ابوزکریا تبریزی (م ۵۰۲ھ) جیسے لغوی اور نحوی، ابوالقاسم الحریری (م ۵۱۶ھ) جیسے نثار اور صاحبِ طرز نظر آتے ہیں جنھوں نے صدیوں دماغوں اور مذاقوں پر حکومت کی ہے، اس مردم خیز عہد اور بغداد جیسی شاداب سرزمین میں وقیع دینی خدمت کے لیے اور ذہنوں اور طبیعتوں کا رخ موڑنے کے لیے اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور جامع کمالات شخص کی ضرورت تھی، جو اس عصر کے تمام مروجہ علوم میں بلند پایہ رکھتا ہو، اور جس کی روحانی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کے علم و فضیلت کی بھی تحقیر ممکن نہ ہو، وہ اس زمانہ کی معیاری اور بلند زبان میں گفتگو کرتا ہو، اس کی مجلس

میں ہر ذوق کے لوگوں کو حظ حاصل ہو، اور کوئی اس کو "عابدِ جاہل" یا "واعظِ بے علم" کہہ کر نظر انداز نہ کر سکے، پھر ضعیف الایمان لوگوں کو اس کی مجلس وعظ اور حلقۂ درس میں یقین کی قوت، ایمان کی حرارت، اہل شک و ارتیاب کو شرح صدر کی دولت، مضطرب و بے چین طبیعتوں اور مجروح دلوں کو سکونِ قلب کی نعمت، حقائق و معارف کے طالبین و شائقین کو دقیق علوم اور لطیف مضامین کا خزانہ بے عملوں اور افسردہ دلوں کو جذبات اور عمل کے محرکات اور قوتِ عمل حاصل ہو۔

بغداد کے دو داعی

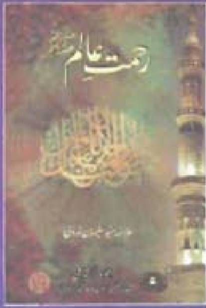
اس پر از کمالات دور میں اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت اور مسلمانوں میں از سر نو ایمانی حرکت و حرارت اور توبہ و انابت کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے دو ہستیوں کو پیدا کیا جن کی ذات سے دین کو بڑی قوت حاصل ہوئی۔ ان میں سے ایک کا نام نامی سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہے، دوسرے عبد الرحمٰن بن الجوزی ہیں، ذوق و رجحان طبع کے اختلاف کے باوجود دونوں نے اپنے زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دین کو ان سے بڑا نفع پہنچایا۔ اس میں بھی خدا کی بڑی حکمت تھی کہ بغداد ان کے قیام و دعوت کا مرکز تھا، جو عالم اسلام کا مرکزِ اعصاب اور اس کا علمی و سیاسی دارالسلطنت تھا اللہ تعالیٰ نے ان کو خدمت کے لیے طویل عمر اور وسیع میدان بھی عطا فرمایا۔

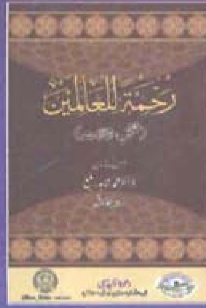
مذہب حنبلی کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ دونوں صاحبوں کا تعلق اسی مذہب کی فقہ و اصول سے ہے۔

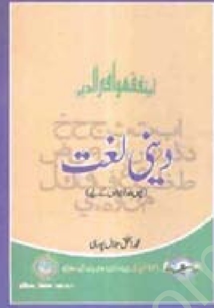


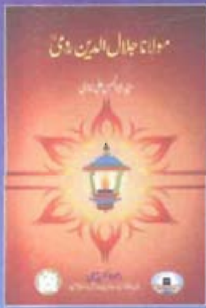
urdukutabkhanapk.blogspot.com

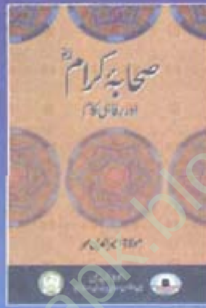
ہماری چند دیگر مطبوعات

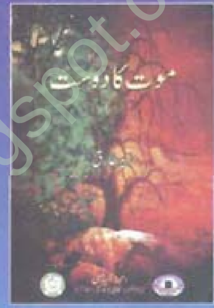


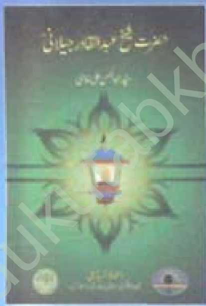


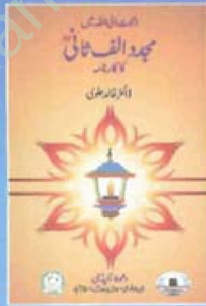


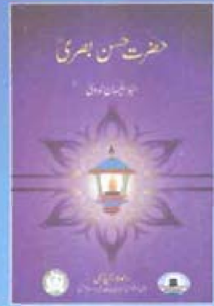














دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی
پوسٹ بکس: 1485، اسلام آباد، پاکستان، فون: 2262031، 051-9261751، فیکس: 051-2261648
ای میل: publications.da.iiui@gmail.com، ویب سائٹ: www.dawahacademy.org